بھرتے ہوئے چھت کو دیکھتے ہوئے کہا، جیسے اللہ وہیں پر بیٹھا ہوا ہے۔

لانڈری روم سے مشینوں کے کھلنے بند ہونے کی آوازیں آنے لگیں تو وہ پھر سے گھبرا گیا۔ اس کے گھر آنے کے بعد ریحانہ گھر کا کوئی کام خاموشی سے نہیں کرتی تھی۔ اسے دس دفعہ جتلاتی تھی کہ "دیکھو مجھے کیسا ماسی بنا کے رکھا ہوا ہے، کوئی کام والی رکھو تو پتہ چلے کہ میں تمھیں کتنی سستی پڑتی ہوں" وغیرہ وغیرہ۔۔ مگر آج ایسا کوئی ڈائیلاگ بھی سننے میں نہیں آ رہا تھا۔۔

"بچے نظر نہیں آ رہے؟" احمد نے وہیں کاؤچ پر بیٹھے بیٹھے چیخ کر پوچھا تاکہ گھر کی پراسرار خاموشی میں کچھ تو ارتعاش پیدا ہو۔

"آج قران شریف پڑھنے جاتے ہیں، ساتھ والی کرسٹینا کو بھی پتہ ہوگا"۔۔ بیوی کی غصے سے بھری آواز نے اس کو توانائی دی اور اپنے آپ کو مزید نارمل محسوس کروانے کے لئے پہلے سے بھی تیز آواز میں بولا: جس کو بتاؤ گی اُسے ہی پتہ ہوگا نا۔۔"

مگر یہ کیا اُدھر پھر سے خاموشی چھا گئی۔۔

"ہیں؟" دل بے چین ہوا اٹھا۔۔" کچھ تو گڑبڑ ہے جن باتوں پر اچھا خاصا محاذ کھڑا ہو جایا کرتا تھا، آج ان باتوں پر جواب ہی نہیں آ رہے، دال میں کچھ تو کالا ہے۔۔ کیا ہے؟ یہ تو تب سمجھ آئے جب ریحانہ منہ سے کچھ پھوٹے، وہ تو کوئی اجنبی عورت بنی ادھر سے اُدھر گھومے جا رہی ہے۔۔"

اور احمد کو زندگی میں پہلی دفعہ احساس ہوا گھر آتے ہی بیوی کا لڑنا کس قدر ضروری ہے۔

آج آفس کی بھی جسمانی سے زیادہ ذہنی تھکاوٹ نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔ بیوی کے پراسرار رویے کے اوپر اب دن بھر کی دفتری زندگی حاوی ہونے لگی، اس نے

آنکھیں موند لیں اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا دی۔۔ وہ کس کو بتائے کہ آج رامیش نے میرے اوپر کیا وار کیا ہے؟ دفتر کا یہ ساتھی اس کی زندگی کا عذاب بن گیا تھا۔

"کاش پورے ٹورنٹو میں کوئی ایسا دفتر ہو جہاں کوئی ذات کا ہندو بنیاء نہ بیٹھا ہو تو پھر دیکھو میں کیسے ترقی کرتا ہوں"۔ ہر سال اسے ترقی کی امید نظر آتی مگر عین وقت پر اس سے یا اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو جاتی تھی اور اسے شک تھا کہ اس سب کے پیچھے رامیش کا ہاتھ ہے اور آج آفس میں ہونے والے واقعے کے بعد تو اس کا شک یقین میں ہی بدل گیا تھا۔

"مالک! اس دفعہ تو نیو ائیر پارٹی میں آؤ گے نا؟ ہر بار کی طرح غائب نہ رہنا"۔ رامیش بھیڑ کے روپ میں بھیڑیا، اس کے میز کے قریب آ کر بڑی نمائشی فکر سے کہہ رہا تھا۔۔

"مفت کی شراب نہیں پینی تو خود ہی سوچ لو کے اس قسم کی پارٹیوں میں میرے لئے کیا کشش ہو سکتی ہے؟" احمد نے جان چھڑاتے ہوئے سیدھی بات منہ پر ماری تھی۔

"مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آتی، تمھیں شراب سے کیا چڑ ہے؟ ساجد بھی تو تمھارے ملک اور مذہب کا ہے، اس نے تو کبھی ایسی بات نہیں کی۔ تمھیں پتہ ہے وکٹر بار بار تمھارا پوچھ رہا تھا لگتا ہے اسے پہلے ہی شک ہے کہ تم پارٹی میں نہیں آؤ گے"۔۔ رامیش نے کسی چالاک عورت کی طرح دائیں بائیں دیکھتے ہوئے اس کے قریب منہ لا کر انکشاف کیا تھا۔۔

"اور تمھیں پتہ ہے ساجد، وکٹر کے بہت قریب ہو گیا ہے اور دیکھنا اس دفعہ اس کے پروموشن کے مواقع بہت روشن ہیں۔ اور تم بس رام رام کرتے رہنا۔"

رام رام نہیں، اللہ اللہ احمد نے غصے کو مشکل سے قابو کرتے ہوئے کہا اور اس کے بدلتے رنگ کو دیکھ کر رامیش نے فوراً اپنی بھی کینچلی بدل لی۔۔" دوست ہوں تمھارا، اور بھلا چاہتا ہوں، غلط نہ سمجھنا مجھے۔۔ ساجد جیسی لچک اور social skills پیدا کر لو۔۔"

"وہ تو تمھارے میں ساجد سے بھی زیادہ اچھی ہیں، تو تمھیں ہی نہ استاد کرلوں اپنا؟ " احمد کا یہ طنز اس کی زندگی کی بہت بڑی کڑوی حقیقت بن چکی تھی۔ اس کا المیہ یہ تھا کہ ساجد اور رامیش نے کام اس سے سیکھا تھا مگر اسی لچک مچک کی وجہ سے چھلانگیں مارتے ہوئے اس سے کہیں آگے نکل گئے تھے اور وہ اسی میز پر ایسے ہی سالوں سے بیٹھا ہوا تھا۔ اور پتہ نہیں کب تک ایسے ہی بیٹھے رہنا تھا۔

ابھی وہ رامیش سے ہی نبٹ رہا تھا کہ دوسری " بلا " ان کا باس وکٹر اُسی کی میز کی طرف آتا دکھائی دیا تھا۔۔ " یک نہ شد دو شد "۔۔

احمد نے دل میں ایک دفعہ تو ارادہ باندھا کہ وہاں سے چپ کر کے بھاگ جائے، مگر اس سے پہلے وہ اس ارادے کو عملی جامہ پہنا تا، وکٹر ان کے سر پر موجود تھا۔ اور رامیش صاف نظر آنے والی مبالغہ آمیزی اور منافقت سے وکٹر کی گلابی شرٹ کی تعریف میں مصروف تھا۔

وکٹر نے تعریف سے محظوظ ہوتے ہوئے احمد کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔" امید ہے تم دونوں نیو ائیر پارٹی میں آ رہے ہو؟"

" کیوں نہیں؟ نہ آنے کی وجہ مالک کے پاس ہے، ہمارے پاس تو ایسی کوئی وجہ نہیں ہے۔۔ رامیش نے پھر احمد کی ٹانگ کھینچتے ہوئے کہا تھا۔

" کیوں مالک رامیش سچ کہہ رہا ہے؟ وکٹر کے انداز میں اب تھوڑی ناگواری شامل ہوگئی تھی۔۔

احمد ملک، جواب صرف مالک بن کے رہ گیا تھا۔ خاموشی سے بس سر کو آگے پیچھے ہی ہلا سکا۔۔

" کیا کرتے ہو؟ شکاگو سے بگ باس آ رہے ہیں اور یہ ملنے ملانے کا نایاب موقعہ

ہوتا ہے اور تم اسے ہر سال ضائع کر دیتے ہو"۔۔ وکٹر کا موڈ مزید غصے کی طرف جا رہا تھا مگر اسی لمحے گلوریا رحمت کا فرشتہ بن کر آ گئی تھی۔

"خیریت ہے تم سب لوگ اس معصوم کی میز کے گرد کیوں گھیرا ڈالے کھڑے ہو؟ کیا یہ کوئی اہم اعلان کرنے والا ہے یا اس کے بارے کوئی اہم اعلان ہونے والا ہے۔۔؟ " اتنی سی بات پر رامیش اور وکٹر یوں قہقہہ مار کر ہنسے جیسے اس صدی کا سب سے بڑا لطیفہ سنایا گیا ہو۔۔

احمد کی زندگی کا یہ بھی ایک اور بہت بڑا دکھ تھا، جب سے وہ کینیڈا آیا تھا، یا جب سے اس دفتر میں آیا تھا، اسے پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کس بات پر قہقہہ مارنا ہے اور کون سی بات صرف زیرِ لب مسکرا کر چپ کر جانے والی ہے اور کس بات پر بھرپور حیرت کا اظہار کرنا ہے۔ وہ ہمیشہ ہی ترتیب الٹی کر دیتا تھا کہ ہنسنے والی بات پر خاموش رہتا تھا اور خاموش رہنے والی بات پر اس کا تنہا قہقہہ گونج اٹھتا تھا، اس بات سے بھی اس کا باقی لوگوں کے ساتھ ایک بیگانگی کا پردہ برقرار رہتا تھا جو اسے شدت سے احساس دلاتا تھا کہ وہ ان میں سے نہیں ہے۔۔

رامیش اور ساجد اس کے جیسے ہونے کے باوجود اس خیال کو اور بھی تقویت پہنچانے کا باعث بنتے تھے۔

" مالک، ائیر اینڈ کلوزنگ کا دارومدار تم پر ہی ہے، کچھ نمبرز کو آگے پیچھے کرنا ہے"۔۔ وکٹر کے موڈ ایسے ہی عورتوں کی طرح بدلتے رہتے تھے، اسی وقت اس نے رامیش اور گلوریا کی طرف دیکھتے ہوئے احمد کی تعریف کی تھی" نمبرز میں یہ شخص کمال ہے"۔

گلوریا نے اس پر بھرپور تعریفی نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا" اس میں کیا شک ہے کل رات بھی مالک کے کام کی تعریف کر رہا تھا"،

گلوریا کے منہ سے بنک کے صدر کے اس کے لئے تعریفی الفاظ سن کر وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اسے ہمیشہ صرف یہ زبانی کلامی تعریف سے ہی ٹرخا دیا جاتا ہے، ترقی دیتے ہوئے یہ کم بخت لچک مچک آڑے آجاتی ہے۔

مگر رامیش سے اس کی یہ زبانی تعریف بھی برداشت نہیں ہوئی تھی، احمد نے اس سنہری لمحے کو جس میں رامیش گھبرا کر تھوک نگل رہا تھا، آنکھوں میں بسا لیا تھا، پورے سال کی راحت کا سامان تھا اس ایک تصویر میں اور اسے رامیش کی بے بسی پر بڑا مزہ آیا تھا، مگر اس کی خوشی اور مزا زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہا تھا، جلد ہی اس چالاک لومڑ نے کایا پلٹ دی تھی۔۔

"وکٹر تمھیں پتہ ہے مالک بہت funny ہے کل کہہ رہا تھا" پرائڈ پریڈ" کو" پرائڈ پریڈ" کہنا کتنی بے وقوفی کی بات ہے، اس میں بھلا" پرائڈ" والی کیا بات ہوتی ہے؟ جس چیز کو چھپانا چاہیئے اسے پرائڈ بنا کر بے شرمی سے پریڈ کی جاتی ہے۔ ہاہاہا"۔ رامیش نے وکٹر کی گلابی شرٹ اور کان کے بالے کو پیار سے تکتے ہوئے کہا تھا۔۔

وکٹر کا رنگ ایک دم کپاس کے پھول جیسا ہو گیا تھا اور احمد کے تو جیسے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے تھے۔۔

"میں تو کہہ رہا تھا ایک غیر فطری۔۔ میرا مطلب غلط کام،، میرا مطلب۔"۔۔ وکٹر کے سامنے اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ہم جنس پرستی کے خلاف اپنے خیالات کو کس طرح چھپائے۔۔

"میں میں کیا مالک، تم کہہ رہے تھے نا کہ یہ نہیں ہونا چاہیئے"۔۔ رامیش اب اس کی ٹانگ کھینچ نہیں بلکہ چبا رہا تھا۔۔" تو میں نے سوچا ساجد سے پوچھوں، وہ تو تمھارے ہی مذہب اور ملک کا ہے، مگر وہ تو تم سے بالکل مختلف ہے، اسے میری طرح آزادئ اظہار پر

یقین ہے۔ انسان کی آزادی پر، جو دل کرے کرو، جو دل کرے بولو، کھاؤ پہنو، کوئی کسی کو پابند نہ کرے اور اچھائی برائی کے فیصلے خود نہ کرے، ۔۔۔"۔

"رامیش اسی لئے تو تم اس دفتر میں ہر دلعزیز شخصیت ہو۔ تمھاری اچھی سوچ تمھیں اور آگے لے کر جائے گی اور تنگ سوچ والے لوگ ساری عمر ایک میز پر بیٹھے گذار دیں گے۔۔" وکٹر زہر آلود نظروں سے احمد کی میز کو دیکھتے ہوئے اپنے کیبن کی طرف چلا گیا تھا۔۔

احمد کا دل کر رہا تھا، اس مکار کا منہ نوچ لے۔ مگر وہ مکار اب گلوریا پر جھکا اسے کہہ رہا تھا" تم ہی اس کو سمجھاؤ کہ پارٹی میں آجائے، یہی تو سب سے گھلنے ملنے کا موقع ہوتا ہے"۔ یہ کہتے ہوئے وہ تمسخرانہ انداز سے احمد کو دیکھتا ہوا اپنے میز کی طرف چل پڑا تھا اور گلوریا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے کہا تھا" مالک پارٹی میں آنے کی کوشش کرنا، رامیش سب کا بھلا چاہتا ہے بڑا اچھا انسان ہے۔"

اور احمد میگی کے لمس سے وقتی طور پر اس بھلے انسان کے زہریلے وار کو بھی بھول گیا تھا اور یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ اس سال بھی ترقی کے میڈل رامیش یا ساجد کے کندھوں پر سجیں گے اور وہ بس اسی میز پر۔۔۔

اب کاؤچ پر لیٹے ہوئے بھی اسے اپنی اس سال بھی ترقی نہ ہونے کا پیشگی غم کھائے جا رہا تھا مگر ایسے میں پچھلے جمعے کو سنے ہوئے مولوی صاحب کے خطبے نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا اور اس کے خوبصورت الفاظ احمد کے کانوں میں گونجنے لگے:

"دنیا فانی ہے، ایک سراب ہے، اصلی دنیا مرنے کے بعد شروع ہونی ہے۔ اس لئے اس دنیا کی نہیں، اگلے جہاں کے سامان کی تیاری کرنی چاہیئے یا خالی ہاتھ جانا ہے؟

نمازی یک زبان ہو کے بولے تھے۔۔"نہیں"۔

"اللہ کو راضی کرنا ہے تو اس جہاں کی عارضی چیزوں کے پیچھے نہ بھاگو، اللہ سے لو لگا

کے رکھو، کافر ملک میں اپنا ایمان بچا کے رکھو، یہ تمھارے نفس کا جہاد ہے، اس میں سے کامیاب نکل گئے تو آخرت کی مستقل خوشیاں تم لوگوں کا مقدر ہونگی، دنیا کی دوڑ میں لگ گئے اور عیش وعشرت میں پڑ گئے تو جہنم کی آگ میں جلا دیئے جاؤ گے"

مولوی صاحب کا خطبہ یاد آتے ہی اسے دفتر کے تمام لوگ بدنصیب اور جہنمی لگنے لگ گئے۔ رامیش اور ساجد اپنا ایمان بیچ کر دنیا کی ترقی لے سکتے ہیں مگر میری طرح وکٹر کے غیر فطری اور غیر اسلامی طریقے کو بہادری سے تنقید کا نشانہ نہیں بنا سکتے، وہ شراب اور خوشامد کے سہارے ترقی پا بھی لیں تو میری طرح دوسری مستقل دنیا میں سرخرو نہیں ہونگے اور پھر مجھے دنیاوی عارضی ترقی سے کیا لینا۔۔؟ میری منزل تو آخرت کا سامان اکٹھا کرنا ہے۔۔" مگر۔۔۔۔۔۔کاش، یہ کم بخت اس دنیا میں بھی ترقی نہ پائیں۔

خطبے کے الفاظ میں پناہ لینے کے بعد بھی وہ سوچ رہا تھا کہ کاش ان مرُدودوں کی ترقی بھی نہ ہو۔۔ اسے اپنی ترقی نہ ہونے کا اتنا غم نہیں تھا جتنا ان دونوں کی" ہو جانے" کا تھا۔

"ساجد تو پکا دوزخ کی آگ میں جلے گا پھر دیکھوں گا کیسے کافر رامیش اور وکٹر اسے بچانے آئیں گے"۔اس کی بڑبڑاہٹ آواز بن گئی تو، ریحانہ لانڈری سے نکل کر کچن کی طرف جاتے ہوئے رک گئی اور اسے دیکھ کے بولی:

"تم نے جو جنت میں پلاٹ پکا کروایا تھا، اس کی رجسٹری آ گئی ہے؟"

"اس فانی دنیا میں، میں رامیش سے بھی اپنے ساتھ کسی اچھائی کی امید کر سکتا ہوں مگر تم سے نہیں، تم جب اگلنا، زہر ہی اگلنا۔۔ دو میٹھے بول تمھارے پاس نہیں ہیں؟"۔۔احمد اس امید پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا کہ اب نارمل لڑائی شروع ہونے ہی والی ہے۔۔

مگر یہ کیا ریحانہ نے اس کی طرف وہی خاموش گھوری اچھالی اور تیزی سے کچن کی

طرف نکل گئی، اب یہ ذلت آمیز بے رخی برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔" دل تو چاہ رہا ہے اس بدلحاظ عورت کے پاس جاؤں اور اسے مولوی صاحب کے خطبے کے وہ حصے سناؤں جس میں انہوں نے بیویوں کے فرائض پر اتنی شاندار روشنی ڈالی تھی۔۔لیکن پھر شکر ہے وقت پر ہی اسے خیال آ گیا کہ اب یہ بھی ممکن نہیں رہا تھا جب سے ریحانہ نے درس پر جانا شروع کیا تھا اسے قران اور حدیث کی وہ سب باتیں ازبر یاد تھیں، جن میں عورتوں کے حقوق پر بات کی گئی تھی۔ اور ان کی روشنی میں ایسے لگتا تھا جیسے یہ زمینی عورتیں نہیں بلکہ وہ حوریں زمین پر اتر آئی ہیں جن کے ملنے کا وعدہ جنت میں جانے کے بعد کا ہے۔

بات اسلام تک ہی رہتی تو وہ مولوی صاحب کی مدد سے سنبھال سکتا تھا مگر جب سے ریحانہ کی ایک دوست نے پیرالیگل کا امتحان پاس کر لیا تھا، احمد کا امتحان شروع ہو چکا تھا اور اب بات اس کے قابو سے باہر ہو چکی تھی۔ وہ سہیلی، ریحانہ کو ایسی قانونی سمجھ دے چکی تھی کہ وہ، ریحانہ کم اور راکھشس زیادہ لگنے لگی تھی۔ اس نے سوچا اب مولوی صاحب کو جمعے والے دن زیادہ چندہ دوں گا اور کہوں گا کہ درس والی اور قانون والی دونوں کی باتوں کے توڑ والی کچھ ایسی پراثر حدیثیں سنائیں کہ یہ بدذات عورت قابو میں آ جائے۔۔ یہ سوچ کر اس کے دل کو کچھ تسلی ہوئی۔

" کینیڈا آ کر تو سب کچھ ہی بدل گیا تھا۔ لوگوں کا نہ دین رہا تھا نہ ایمان۔ شکر ہے میں نے آفس کے اور گھر کے محاذوں سے تنگ آ کر دین کی راہ نہیں چھوڑی ورنہ میرے دوست آصف کا حال تو سامنے ہی ہے، وہ بھی کیسا کیسا کفر بکنے لگ گیا تھا، اچھا کیا میں نے اس سے دوستی چھوڑ دی "۔

اسے یاد آیا جب آصف نے بڑے دکھ سے بتایا تھا کہ " دیکھو یہ مولوی کیا کرتے پھر رہے ہیں؟"۔

اور بات بھی کس مولوی کی کر رہا تھا، جس کے کہنے پر احمد نے نماز شروع کی تھی اور جس کی وجہ سے بے شرم اور آزاد ملک میں اپنے ایمان کو سلامت رکھے ہوئے تھا۔ اس اللہ والے کے بارے میں آصف اول فول بک رہا تھا، کہ انہوں نے کہا ہے کہ:

"اپنے کلائنٹس کو کہنا کہ مسجد کو اگر وہ سو ڈالرز کی ڈونیشن دیں گے تو مسجد انہیں پانچ سو ڈالر کی رسید دے گی تاکہ وہ ٹیکس میں ظاہر کر کے ریونیو کینیڈا سے زیادہ وصولی کر سکیں۔"

"ایسا دہریہ ہو گیا تھا کہ مولوی صاحب پر ایسا غلیظ الزام لگاتے ہوئے ذرا بھی شرمسار نہیں تھا، کہاں مولوی صاحب جن کے ماتھے پر محراب کا نشان چمکتا ہے اور کہاں یہ بے دین، بے ایمان شراب پینے والا انسان، شرم ہی نہیں آتی لوگوں کو، کینیڈا میں آ کر خدا کو بھول بیٹھے ہیں۔ اللہ ہی ان سے پوچھے میں تو تھک گیا ہوں"۔

کچن سے برتن پٹخنے کی آوازیں آ رہی تھیں اس نے نڈھال ہو کر آنکھیں بند کر لیں مگر یہ کیا آنکھیں بند کرتے ہی گلوریا کا نرم گرم وجود چھم سے سامنے آ کھڑا ہوا" کیسی پیار لٹاتی، نرم زبان کی لڑکی ہے، کتنے پیار سے اس نے میرے بازو پر ہاتھ رکھا تھا"

مگر افسوس وہاں بھی اس کے کانوں میں مولوی صاحب کے الفاظ چیختے چنگھاڑتے آ پہنچے تھے، اور اس نے گلوریا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا، یہ اور بات ہے کہ جھکی آنکھوں کے آگے ننگی سڈول پنڈلیاں آ ٹکی تھیں۔۔ نعوذ باللہ۔۔ اب بھی دیکھو خیالوں میں کیسے وہی پنڈلیاں بے دھڑک گھسی چلی آ رہی ہیں۔

"لاحول ولا قوۃ، عورت کے چلتر، ان سے کون بچ سکا، یہی تو جہاد ہے بھیا"۔ احمد نے بند آنکھوں کے پیچھے سے اپنی پیٹھ تھپکی۔

چائے نوش فرما لی ہو تو میں کچھ بکوں؟ گلوریا کی ملائم شکل ایک دم بیوی کی کرخت

آواز میں بدل گئی۔۔۔

"ٹن ٹن"۔۔۔ خطرے کے الارم نے اس کے جسم کو جھنجوڑ دیا۔۔۔" آؤ آؤ کیوں نہیں"۔۔ اس نے خوفزدہ ہو کر پیار سے بیوی کو پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"بیٹھنا کیا؟ بیٹھ تو تم گئے ہو مسٹر احمد، یہ لو تمھارے نام بنک کا محبت نامہ آیا ہے" ۔۔۔ بیوی کی آواز میں کرختگی بڑھتی جا رہی تھی۔۔

" کیا ہے اس میں؟ا" بھی بھی بات احمد کی سمجھ سے باہر تھی۔۔

"اس میں یہ ہے کہ بنک کو آپ 50000 ڈالرز حق مہر دے دیں"۔۔ بیوی نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

" کیا مطلب؟ا" حمد نے لفافہ جلدی جلدی کھولتے ہوئے کہا اور بنک کا 50000 ڈالرز جمع کروانے کا نوٹس پڑھ کر اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔۔

" دیکھو بنک کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے "اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے، بیوی کے غیض وغضب کو قابو کرنے کی ایک کمزور سی کوشش کی۔۔

"غلط فہمی بنک کو نہیں تمھیں ہوئی ہے۔۔" بیوی غرائی۔

نامعلوم کی پر اسراریت غائب ہو چکی تھی اور اب گھر کی فضا نارمل سے بھی زیادہ نارمل تھی، بیوی کے ماتھے کی تیوری اور لال رنگت احمد کی آنکھوں کے آگے ناچ رہی تھی، اور باقی سب اندھیر ہو چکا تھا۔

" کیا کہا تھا میں نے تمھیں؟ کہا تھا نا کہ اس بچت سے بچوں کے لئے کوئی اپارٹمنٹ بُک کروا لو اور تم نے کیا کہا تھا۔۔ یاد ہے؟ بیوی نے اس کی ٹھوڑی گردن سے اُٹھاتے ہوئے کہا۔۔" تم نے کہا تھا نہیں جنت میں گھر پکا کروانا ہے، اب کراؤ جنت میں

ایڈوانس بکنگ۔۔تم تو دنیا میں کہیں کے نہیں رہے، اب ماتم کرو بیٹھ کر۔۔بیوی اب صرف دھاڑ رہی تھی۔

"جذباتی نہ بنو، اپنے آپ کو کنٹرول کرو، کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، مجھے کسی سے بات تو کرنے دو۔۔وہ ایک سانس میں بولے جارہا تھا۔۔

"یہ لو کرو بات، مگر میری نہیں، اپنی غلط فہمی دور کرو"۔بیوی نے پلک جھپکتے ہی فون اس کے ہاتھ میں دے مارا۔۔

کانپتے ہاتھوں سے مولوی صاحب کا نمبر ملایا، نمبر ملتے ہی دوسری جانب سے نہایت میٹھی سی آواز میں "ہیلو" کہا گیا۔

"میری مولانا فرقان صاحب سے بات کروائیں۔۔جلدی!۔۔"۔احمد نے سانس لئے بغیر مدعا بیان کر دیا۔۔

"مولانا صاحب تو حج کے لئے تشریف لے جا چکے ہیں" دوسری طرف سے اسی میٹھے لہجے میں بتایا گیا۔

"کیسے؟ کیوں؟" احمد بے تابی سے چیخا۔۔

"ہیں؟ یہ کیا سوالات ہوئے، پھر بھی بتائے دیتا ہوں، کیوں کا جواب ہے کہ یہ اسلام کا بنیادی رُکن ہے اور ہر صاحب استطاعت مسلمان کا فرض ہے، اور کیسے کا جواب یہ کہ ہوائی جہاز کے ذریعے، حج کا پورا گروپ لے کر گئے ہیں ماشااللہ سے۔۔"۔آواز کی مٹھاس احمد کے دل کو نہ سنبھال سکی۔۔

"حضرت آپ کون ہیں" احمد نے بے تابی سے میٹھے انسان سے پوچھا۔

"میں مولانا فرقان صاحب کا نائب قاری حفیظ ہوں" اب آواز میں مٹھاس کے

ساتھ ہلکا سا رعب بھی شامل ہو چکا تھا۔

بیوی کمر پر ہاتھ رکھے اسے مسلسل گھورے جارہی تھی اور وہ بے یقینی کے گہرے سمندر میں اندھا دھند ہاتھ پاؤں مار کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا:

"دیکھئے میرا نام احمد ملک ہے، شائد مولانا فرقان نے آپ سے میرا ذکر کیا ہو، قاری صاحب! میں نے آپ کو مولانا فرقان کے ساتھ کبھی نہیں دیکھا مگر میں آپ کو بتاتا ہوں، میں نے مولانا صاحب کی درخواست پر مسجد بنانے کی غرض سے اپنا پلاٹ دے دیا تھا۔۔"

"اچھا تو پھر جناب؟ اللہ کا گھر بنانے کو دیا تھا یا پھر مولانا صاحب کو ذاتی گھر بنانے کے لئے؟" میٹھی آواز میں ایک دم سے بے رخی اتر آئی۔

"اللہ کے گھر کے لئے ہی دیا تھا، مگر آپ میری بات نہیں سمجھ رہے۔ مجھے بنک سے نوٹس آیا ہے کہ چھ مہینے سے بنک کو اس پلاٹ کی مارگیج نہیں گئی ہے اور بنک نے پلاٹ پاور آف سیل پر بیچ دیا ہے مگر پھر بھی بنک کو پچاس ہزار ڈالرز کا نقصان ہو رہا ہے اور چونکہ پلاٹ میرے نام ہی ہے اس لئے بنک نے مجھے یہ پیسے فوراً جمع کروانے کو کہا ہے، آپ کو سمجھ آرہا ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔" سمجھاتے سمجھاتے احمد کا گلا خشک اور آنکھیں تر ہو گئیں۔

"اوہ اچھا آپ اس ویران پلاٹ کی بات کر رہے ہیں، قبلہ، مولانا صاحب کا خیال یہ تھا کہ آپ کے پلاٹ پر مسجد بنانا فائدہ مند نہیں ہے، کیونکہ وہاں مسلمان کم رہتے ہیں اس لئے نمازیوں کی تعداد کم ہوگی اور اسی وجہ سے مسجد کو چندہ کہاں سے ملے گا اور اخراجات کہاں سے پورے ہونگے؟ آپ ایک پلاٹ دے کر بری الزمہ ہو کر بیٹھ گئے تھے، مولانا

صاحب کو سب سوچنا پڑتا ہے، آپ ذاتی نفع نقصان کو رو رہے ہیں، مولانا صاحب نے اللہ اور اس کے گھر کے وسیع ترین مفاد کو مدنظر رکھنا ہوتا ہے۔۔ہم نے تو الحمداللہ نئی مسجد کی کسی اور جگہ تعمیر بھی شروع کروادی ہے۔۔وہاں اللہ کے فضل سے مسلمان آبادی خوب ہے۔۔۔ سمجھے آپ؟" قاری صاحب نے انتہائی وقار سے اپنی بات ختم کی۔۔۔

"قاری صاحب آپ عجیب بات کر رہے ہیں۔اگر مولانا صاحب نے یہ فیصلہ کر ہی لیا تھا تو کم از کم مجھے اطلاع تو کر دیتے تاکہ میں اپنے پلاٹ کی قسطیں خود دیتا تو رہتا، آپ نے تو مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔۔۔برباد ہو گیا ہوں میں۔۔کہاں سے دوں بنک کو پچاس ہزار ڈالرز۔۔پلاٹ سے الگ ہاتھ دھو بیٹھا ہوں۔۔کیا کروں میں۔۔آپ کو سمجھ آ رہی ہے؟"اب احمد باقاعدہ رونے لگ گیا۔۔بیوی کا ہاتھ بھی کمر سے ہٹ کر تسلی دینے کے لئے احمد کے کندھے پر آ ٹکا۔

"دیکھئے حضرت مولانا صاحب کو الزام نہ دیں۔آپ نے پلاٹ اللہ کا گھر بنانے کے لئے اللہ کے حوالے کیا تھا تو مولانا صاحب کیوں ڈاکئے بن کر آپ کو اطلاعات پہنچاتے رہتے؟ آپ کا اور خدا کا معاملہ ہے بھائی، ہمیں نہ درمیان میں گھسیٹیں۔"

"مجھے مولانا صاحب نے کہا تھا اُس مسجد میں جتنے سجدے ہونگے، فی سجدہ مجھے دس نیکیوں کا ثواب ملے گا اور ساتھ میں جنت میں گھر ملے گا، میں نے تو جنت اور نیکیوں کے لالچ میں اپنی دنیا ہی اُجاڑ دی، میں نے اپنی ساری جمع پونجی آنکھیں بند کر کے مولانا کے ہاتھ پر دھر دی تھی۔۔اور یہ صلہ ملا مجھے۔۔۔؟۔"

قاری صاحب نے احمد کی بات درمیان میں ہی اچک لی:

"اپنے آپ سے پوچھیں کہ آپ نے کیا گناہ کئے ہیں کہ خدا نے آپ کی یہ بخشش قبول نہیں کی؟ اپنی زندگی کا جائزہ لیں کیا غلطیاں سرزد کر بیٹھے ہیں کہ اللہ نے آپ کو یہ مقام

نہیں دیا؟ آپ کے مقدر میں سجدوں کا ثواب کیوں نہیں تھا؟ اپنے گناہوں کی توبہ کریں، اپنی نیت کو جانچیں، ہم اللہ والوں کو کس دنیاوی جھنجٹ میں گھسیٹ رہے ہیں، یعنی کہ ایک اور گناہ کما رہے ہیں۔۔اللہ توبہ کریں جی"۔۔وعظ طول ہی پکڑتا جا رہا تھا، یہاں تک کہ احمد کے کانپتے ہاتھوں سے ریسیور پھسل گیا اور اسے لگا اس کے جسم سے کوئی آہستہ آہستہ جان نکال رہا ہے۔

اس رات اسے عجیب عجیب خواب آتے رہے۔ایک لمبی سی سیڑھی ہے جو آسمانوں تک جاتی ہے، رامیش اور ساجد اس پر پھلانگتے ہوئے نجانے کہاں سے کہاں نکلتے جا رہے ہیں، بنک کا لفافہ اڑوس پڑوس کی چھتوں پر ناچتا پھر رہا ہے، جس گھر کی چھت پر جاتا ہے اُسی کے مکین اسے کھول کر پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، وکٹر کی گلابی شرٹ احمد کی گردن میں ٹائی کی طرح لٹک رہی ہے، اور ایک چہرہ جو کبھی ریحانہ کا بن جاتا ہے اور کبھی گلوریا کا، اسے چوم رہا ہے۔پھر ایک عورت کا بے لباس جسم ہے جو اس کے ساتھ محوِ رقص ہے، مولوی صاحب شراب پی کر نماز پڑھنے کی جھوم جھوم کر تلقین کر رہے ہیں، نمازی مسجد کی بجائے شراب خانوں میں سجدے کر رہے ہیں۔۔۔۔ایک بے ہنگم سا شور ہے جو اس کے کان پھاڑے دے رہا ہے اور وہ چیخ مار کر اٹھا تو اس کا سارا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔۔۔کچھ ہوش آئی تو دیکھا صبح کا سورج تو طلوع ہو چکا تھا مگر اندھیرا ابھی وہیں تھا۔۔

حسبِ معمول تیار ہو کر، دفتر کے لئے گھر سے نکلنے لگا تو بیوی کی کچن سے آواز آئی

" آج کوشش کرنا جلدی گھر آ جاؤ، مسز تنویر نے نئے سال کے لئے اپنے گھر میں قران خوانی رکھی ہے تو وہاں اپنے لئے بھی دعا کروا لیں گے شائد اللہ ہمیں اس مشکل سے نکال دے"

" مگر میرے دفتر میں آج نیو ائیر کی پارٹی ہے، اس لئے میں آج جلدی گھر کسی قیمت پر نہیں آ سکتا۔۔"اس نے ایسے ٹھوس اور سرد لہجے میں کہا کہ بیوی کی ہڈیاں سننا

اٹھیں۔۔۔

" مگر تم تو دفتر کی ایسی پارٹیوں میں کبھی نہیں جاتے۔"

" مگر آج میں وکٹر کے ہاتھ پر بیعت کرنے والا ہوں، جو وہ کہے گا ویسے ہی کروں گا اور پھر دیکھوں گا کیسے یہ ساجد اور رامیش ترقی کرتے ہیں۔" وہ اتنا آہستہ بولا جیسے صرف خود کو ہی بتا رہا ہو۔

" کیا کہا؟ بیوی کو اس کی آواز ٹھیک سے سنائی نہیں دے رہی تھی۔

" کچھ نہیں کہا" ۔۔اور دروازے کی طرف تیزی سے چل دیا جیسے ذرا سی دیر ہو گئی تو نئے ارادے پھر نہ کہیں ڈھے جائیں۔

" لنچ تو لیتے جاؤ" ۔۔ بیوی پیچھے بھاگی مگر بھنے حلال گوشت کا ڈبہ اس کے ہاتھ میں ہی رہ گیا اور مالک نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔۔ اندر آ کر ریحانہ نے دیکھا، آج احمد کی جاء نماز کی تہ نہیں کھلی تھی۔۔ نماز قضاء ہو چکی تھی اور دنیا کے کام کاج کا وقت شروع ہو چکا تھا اور آج لگتا تھا احمد نہیں مالک گھر سے نکلا ہے۔

لا یموت

"صدیوں بعد بھی ملو گی تو کیا ایسی ہی رہو گی؟" قیصر نے سگریٹ کا دھواں سامنے بیٹھی عورت کے منہ پر چھوڑتے ہوئے کہا۔

"اور تم جب بھی ملو گے یونہی میرے حسن سے جلتے رہو گے"؟" دیکھو باہر اندھیرا پھیل گیا ہے" ۔عورت نے سگریٹ کے دھوئیں کو سانس میں بھرتے ہوئے کہا۔

"تم ابھی تک اندھیرے سے سہمتی ہو؟ میں تو اب چٹے سفید دن سے ڈرتا ہوں۔"

" قیصر! کیا تمھیں روشنی سے کوفت ہونے لگ گئی ہے؟ تم جو مجھے ساری رات فون پر باتوں میں یہ لالچ دے کر لگائے رکھتے تھے کہ، رک جاؤ، اکھٹے سورج کو آسمانوں سے اگتا ہوا دیکھیں گے۔

"صوبی! کیا تمھیں پتہ نہیں چلا کہ ہم دونوں ایک سا سورج کبھی نہیں دیکھ سکتے۔تو پھر بولو اب اس روشنی سے میری کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟

ہاہاہا۔۔۔ہاہاہاہا۔۔۔اس کے قہقے سے دھواں دائروں میں گھومنے لگا۔

ابھی بھی ویسے ہی ہنستی ہو، بریکیں لگا لگا کے؟

"ہاں تو اور کیا" وہ چہکی" میں نہیں بدلی" ۔۔

"ہاں مگر آنکھیں بدل گئی ہیں، جاؤ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھو ہنستی ہو تو آنکھیں چہرے کا ساتھ چھوڑ جاتی ہیں۔۔"

"تم نے کون سا ان آنکھوں کی پرواہ کی؟ کہاں تھے اتنے سالوں سے؟ تم جانتے تھے نا کہ تمھارے علاوہ میرا کوئی دوست نہیں تھا، جاؤ! تُم نے تب پرواہ نہ کی تو اب کیا کرو گے؟ باہر اندھیرا ہو گیا یا آنکھیں مجھے چھوڑ گئیں، تمھیں اس سے کیا؟

"دل پر اور بوجھ نہ بڑھاؤ، احساس گناہ نہ دو، میں اب بہت کم زور ہو گیا ہوں، تمھارے منہ سے نکلے ہر لفظ کو پورا کرنے والا "قیصر" نہیں رہا".

"میں بھی بغیر سوچے فرمائیشیں کرنے والی صوبیہ نہیں رہی، جانتے ہو میں تمھیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ تم نے مجھے اتنے لاڈ دیئے، میرے باپ بن گئے، میرے بھائی بن گئے میرے دوست بن گئے یہاں تک کہ میری ماں بھی بن گئے اور پھر اچانک، بے آسرا چھوڑ گئے، زمانے کے رحم وکرم پر۔۔جانتے ہو۔۔۔۔۔؟"

مجھے معاف کر سکتی ہو؟ وہ میز کے دوسری طرف سے اٹھا اور عورت کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"مجھے ٹوکو نہیں، بولنے دو، تم میرے گنہگار ہو"۔۔وہ پتھر کی طرح بیٹھی رہی۔

"ہاں پتہ ہے, اس لئے تمھارے سامنے سر جھکایا ہوا ہے, رونے کو تمھیں اپنا کندھا نہیں دے سکتا, اپنے ہاتھوں سے تمھارے آنسو نہیں صاف کر سکتا بس تمھارے آگے اپنا سر جھکا سکتا ہوں۔۔جانتی ہو نا میں نے تمھارے سامنے پہلا سجدہ کب کیا تھا؟ تمھیں کیسے پتہ ہو گا میں نے تو یہ کبھی تمھیں بتایا ہی نہیں، کالج کے شروع شروع کے دن تھے اور تم اپنی کلاس کے سامنے کھڑی تھیں، میں نیچے گراؤنڈ میں دوستوں کے ساتھ تھا، کسی لڑکے نے تمھارے متعلق کوئی بات کی اور اسی لمحے تم نے بال جھٹک کر غیر ارادی طور پر ہماری سمت ہی دیکھا تھا۔ جیسے تمھاری چھٹی حس نے تمھیں بتا دیا ہو کہ کہیں دور لڑکوں کے ٹولے میں تمھاری بات ہو رہی ہے۔ اس دن تمھارے اور میرے درمیان بہت فاصلہ تھا، مگر مجھے آج بھی نیلے رنگ

کا وہ سوٹ یاد ہے جس میں تمھارا چہرہ چمک رہا تھا، تمھاری آنکھوں پر بال گرے ہوئے تھے، جنہیں تم نے جھٹکے سے پیچھے کیا تھا اور میں تو بس وہیں پر زمین دوز ہو گیا تھا۔۔"

"تمھارے زمین دوز ہونے کا کیا ہے, یاد ہے جب تمھیں ماریہ سے عشق ہو گیا تھا تم نے سب سے پہلے یا شائد اسے بتانے کے بعد مجھے فون پر بتایا تھا، تمھارے الفاظ آج بھی میرے کانوں میں ایسے گونجتے ہیں جیسے کل ہی کی بات ہو، تم نے کہا تھا "اس نے مجھے آواز دی ہے"۔ اگلے دن ہمارا سالانہ امتحان تھا، مگر میرے امتحان کی گھڑی شائد وہی تھی۔"

"ہاں تم نے مجھے ہولڈ کروایا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ تم مجھے روکو گی۔۔تم مجھ سے نہ جانے کی بھیک مانگو گی مگر تم تو ہنستی مسکراتی واپس آ گئی۔۔"

"میں نے کیوں روکنا تھا، میں نے کون سا تم سے شادی کرنی تھی، اس کے باوجود اس وقت مجھے پتہ نہیں کیا ہوا تھا، تمھیں ہولڈ کروا کے گئی اور جا کر ٹوائلٹ میں قے کر آئی"

"اوہ! وہ تم قے کر کے آئی تھی؟ میں نے سوچا شائد تمھاری امی نے آواز دی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے آ کر تم نے یہی کہا تھا."

"ہاں تو اور کیا کہتی؟ جانتے ہو نہ مجھ سے اصلی بات نکلوانا کتنا مشکل کام ہوتا تھا، مگر تم تو میرا چہرہ پڑھ لیتے تھے، آواز سے پہچان لیتے تھے کہ میں خوش ہوں یا اداس۔۔خیر اس زمانے میں اداسی کا صرف لفظ ہی آتا تھا، اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن شائد اس دن تم نے مجھے جان بوجھ کے اگنور کیا تھا، مجھے اپنی محبت کا حال سنا کے تم بری الزمہ ہو گئے اور بس بہت خوش تھے کیونکہ تمھاری محبت نے تمھیں آواز جو دے دی تھی، میں تو ایکدم سے تمھارے لئے فالتو سی ہو گئی تھی۔"

"لڑکی مجھے یہ بتاؤ تم نے مجھے روکا کیوں نہیں؟

"کس لئے روکتی اور کیا ایسی حالت میں جب کہ مَیں تمھاری خوشی ٹیلی فون سے سن سکتی تھی، تمھیں میری روکنے کی صدا سنائی دیتی؟ کیا تم رک جاتے؟

"تمھاری قسم رک جاتا۔۔"

" مگر میں کیوں روکتی پھر مجھے تم سے شادی کرنی پڑ جاتی، مجھے تو بس تمھاری عادت سی ہو گئی تھی، کبھی کسی نے اتنے لاڈ پہلے کئے جو نہیں تھے۔"

"پاگل لڑکی اپنے لاڈ اٹھوانے کو ہی روک لیتی۔۔"

"ماریہ کی خوانخوار نظروں کا مقابلہ کون کرتا، وہ تو ویسے ہی مجھے کچا کھانے کو تیار رہتی تھی؛ وہ تم سے بہت محبت کرتی تھی۔ اور میں اپنے آپ سے محبت کروانے کے لئے تمھیں اس کی دیوانہ وار چاہت سے کیوں محروم کرتی؟ کس ناطے سے؟ مگر یہ بھی سچ ہے کہ وہ خبر میرے لئے صدمے سے کم نہیں تھی، تب انا کے زور میں کبھی اقرار نہیں کیا مگر اب بتا رہی ہوں کہ میں آج بھی اس صدمے سے کبھی سنبھلی نہیں، شادی شدہ ہو کے بھی، دو بچوں کی ماں ہو کے بھی نہیں۔۔شادی سے پہلے جب بھی کسی نے میرے قریب ہونے کی کوشش کی، دوستی کا ہاتھ بڑھایا، اس دن کی گئی قے نے آگے بڑھ کر میرا راستہ روک لیا اور میں زندگی میں کبھی کسی کو تمھاری جگہ نہیں لا سکی۔ میرے اندر کا دروازہ سختی سے بند ہی رہا۔"

"ہوں!!!۔ اسی لئے اپنے آپ کو تمھارا گنہ گار سمجھتا ہوں، لیکن تم سدا کی بدھو ہی رہنا، اب خدا سے کیا شکایت کرتا رہوں کہ تمھیں حُسن تو دے دیا مگر عقل نہ دی، پاگل تمھارے پاس جب آیا تھا کسی سے محبت کا بتانے نہیں تم سے تمھاری محبت کا پوچھنے آیا تھا اور ہنس نہیں رہا تھا، تمھاری قسم اپنے آنسو کنٹرول کر رہا تھا مگر تم سدا بدھو ہی رہنا۔۔"

"پتہ نہیں!! بس تم میرا سایہ تھے، ایک دفعہ اس سایے سے جدا ہونے کے بعد میں تمام سایوں سے بھاگتی ہی رہی۔۔بس تنہائی کی عادت ڈال لی۔۔"

" تنہائی اور تم۔؟ چوبیس گھنٹے پارٹیوں میں جاتی ہو چالاک لومڑی۔"

تو کیا پارٹیوں میں تنہائی نہیں ہوتی؟ ہجوم میں اکیلی تمھاری سہیلی"۔۔ہا ہا ہا کیسا عنوان ہے؟ اس پر نظم لکھنا، سنو پاگل لڑکے، میری اپنی محفل امتحان سے پہلے والی بس اسی رات تک ہی تھی، جب ہم نے آخری دفعہ اکٹھے سورج دیکھا تھا، قیصر! اس وقت تم پر تو محبت کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، چلو محبت بھی کر لی مگر یہ کیا کہ شادی کرنا بھی ضروری ہو گیا تھا؟ چلو بینڈ بھی بجوا لئے مگر یہ کیا مجھ سے دوستی ہی چھوڑ دی، میری طرف دیکھنا ہی چھوڑ دیا، میری چھوٹی چھوٹی فرمائشیں اور میرے مان ایسے کسی چوک میں لاوارثوں کی طرح تمھارا منہ تکتے رہے، میرے دکھ سکھ کی کوئی سہیلی نہ رہی۔تم نے شادی کر کے مجھ سے میرا باپ، میرا بھائی اور میری سہیلی سب چھین لیا تھا"۔

" کیا تم مجھے کبھی بھی معاف نہیں کرو گی؟"

" قیصر خدا کے واسطے اب آنسو مت بہاؤ، یہ بتاؤ جب میں اپنی شادی کے بعد زمانے کی ٹھوکریں کھا رہی تھی تو تم کہاں تھے؟ میرا دل اب نہیں پگھلے گا، مت رو، میں اب بہت ڈھیٹ ہو چکی ہوں مگر پھر بھی پتہ نہیں کیوں وہی سالوں پہلے والی قے منہ میں آ آ کر لوٹ رہی ہے۔"

"افسوس تو یہی ہے کہ اتنے سال گذرنے کے بعد بھی تم ڈھیٹ نہیں ہوئی، آج بھی ویسی ہی معصوم ہو، جو کتابوں میں محبت ڈھونڈتی تھی، جس کی آنکھوں پر بال گرے رہتے تھے اور جس کا دل لوگوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ٹوٹ جاتا تھا، صوبی تم آج بھی ڈھیٹ ہو جاتی تو اپنے آپ کو تمھاری طرف سے خود ہی معافی دے دیتا مگر تم ہزار سال بعد بھی ایسی ہی رہو گی۔

" تم جیسا دوست پھر کبھی نہیں ملا، پھر کبھی کسی نے سورج ساتھ دیکھنے کی بے ضرر سی

ضد میں فون پر پوری رات باتیں نہیں کیں، وقت دولت ہے، بس یہ دولت کوئی کسی پر بلا وجہ ضائع نہیں کرتا، پاک دوستی کی خواہش کے بدلے ہوس ناک نظریں ہی ملیں، لوگ وقت اور بات ناپ تول کر کرتے ہیں۔ تمھارے جیسا گھاٹے کھانے والا کوئی نہیں ملا۔۔"

"تم اپنے شوہر کے ساتھ سورج کو نکلتے دیکھا کرو۔۔ یہ میرا حکم ہے۔"

"کیا تم ماریہ کے ساتھ سورج کو نکلتے دیکھتے ہو؟ تمھاری تو لومیرج ہے۔۔"

"نہیں اتنی ہمت نہیں تھی، اگر یہ بھی کر لیتا تو تمھارے سے آنکھیں کیسے ملاتا؟ بس شادی کے بعد سے ہی ہم میاں بیوی نے اپنے اپنے سورج اپنے اندر ہی اگا لیئے تھے۔ اور جانتی ہو ویسے سورج اب اگتے بھی نہیں، اگر اب کبھی چھت پر اکیلا کھڑا ہو کر اسی طرح ہاتھ میں فون پکڑے سورج کو نکلتے دیکھتا بھی ہوں تو ان کا سنہرا پن نظر نہیں آتا۔۔لڑکی میں نے تمھیں ہر پل یاد کیا، مگر شادی شدہ زندگی کے فرائض سے کبھی نہیں چُوکا، بہت پیار کرنے والا باپ ہوں اور بہت خیال رکھنے والا شوہر۔۔۔"

"خیال تو تمھیں خوب رکھنا آتا ہے۔ محبت کرنا تو کوئی تم سے سیکھے، تیرے سب ٹوٹکے جانتی ہوں مکار لڑکے مگر پھر بھی تمھارے ساتھ سورج دیکھنا چاہتی ہوں۔۔"

"تم میرے ساتھ سورج دیکھنا چاہتی ہو اور میں تمھیں اپنے درد سنانا چاہتا ہوں۔"

"درد؟ واہ جی واہ!! تمہارے کیا درد؟ جس لڑکی نے تم سے محبت کی اور بدلے میں جس لڑکی سے تمھیں محبت ہو گئی، اس کے ساتھ شادی کر لی تو اب کیا دکھ اور کیا درد؟ جاؤ جاؤ کام کرو اپنا، کسی اور کو اب پاگل بنانا۔"

"تمھیں جو میں نے بتایا تھا تم نے وہی سنا، جو دکھایا وہی دیکھا۔ تُو کملی تو ہمیشہ سے میرے پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتی تھی اس لئے تجھے کیا پتہ میرے ساتھ کیا کیا ہوا تھا۔ ماریہ کی فیملی پرابلمز کی وجہ سے میرے امیر اور شریف ماں باپ اسے بہو بنانے کو تیار نہیں

تھے۔ مگر تم تو جانتی ہو نا کہ تیرا دوست کتنا ضدی ہے۔ ماریہ جب آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتی تھی ہماری شادی کب ہو گی، تو بس میں جی جان لگا کے اس مسئلے کے حل کے لئے نکل کھڑا ہوتا تھا مگر میرے ماں باپ بھی بڑے سخت دل کے نکلے یار، ماریہ کے والدین کی خوب بے عزتی کی تا کہ وہ ہی انکار کر دیں مگر وہ تیری بہن بھی تجھے پتہ ضدی اور میرے عشق میں پاگل۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ اڑ تو گئے مگر والدین نے شادی کے دن بھی ہم سے بدلہ لیا، میرے سگے بھائی اور ماں برات پر ساتھ نہ گئے اور پھر اس کے والدین نے بھی ولیمے پر آنے سے انکار کر دیا۔ ہماری بہت جگ ہنسائی ہوئی۔۔ اس غم میں ماریہ نے اپنے والدین چھوڑ دئے، اس کی تو سوتیلی ماں تھی، چھوڑنا آسان تھا مگر میری سگی نے جب سوتیلا پن کیا تو میں نے بھی اسے چھوڑ دیا، کون اپنی ماں کو چھوڑتا ہے مگر تیرے دوست نے محبت، یا انا یا ضد، جو بھی تھا کی خاطر یہ بھی کر دکھایا۔۔ پھر ماریہ نے ضد کی کہ بیاہ کے تمھارے خاندانی بڑے سے گھر میں ہی جاؤں گی۔ صوبی، وہ تمھاری طرح موم کی گڑیا نہیں ہے بڑی ہٹ دھرم ہے، میری ماں سے مجھے چھڑوا بھی دیا اور اس کے ساتھ رہنے بھی آ گئی اور میں اسی چکر میں ہر روز ایک نئے عذاب سے گذرتا ہوں۔ اس ساس بہو کی روایتی لڑائی کو چھوڑ یہ غیر روایتی دشمنی نے مجھے ناکوں چنے چبوا دئے۔ بیس سال کی عمر میں کون کمانا شروع کرتا ہے ۔۔۔بول۔۔ میری اپر کلاس کے کسی لڑکے کو بیس سال کی عمر میں کماتے دیکھا ہے؟ میں حالات سے مجبور ہو کر وہ بھی کرنے لگ گیا اور اسطرح جھوٹ کے بزنس میں ہاتھ لتھیڑ لئے ۔ میری دوست میرا آئیڈلزم برباد ہو گیا، تیرا دوست برباد ہو گیا۔ اب میں خوشی کا، کامیابی کا ماسک لگائے "جوکر" بنا ڈرامے کر رہا ہوں۔ تم میرا آئینہ نہ ہوتی تو کسے بتاتا کہ میں اِس جھوٹ کی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ جس لڑکی کی خوشی کے لئے اپنے آپ کو برباد کر دیا، رونا تو یہ ہے کہ اُسے بھی خوشی نہیں دے سکا۔ سیج سجانے کے لئے میرے پاس پیسے نہیں تھے

۔آج تک لڑتی ہے اور کہتی ہے سب معاف کر دوں گی مگر یہ کبھی نہیں معاف کروں گی۔ یہ قرض تمھیں اتارنا ہی ہوگا، مروں گی تو میرے جنازے کو خوب سجانا۔۔۔۔۔

اپنے آنسو صاف کر لو، میں تمھارے آنسو آج بھی نہیں دیکھ سکتا، سننے کے لئے ابھی بہت کچھ ہے۔تمھیں یاد ہے نا ماریہ کتنا مدہم بولتی تھی، اور تمھارے مقابلے میں تو اور ہی مدہم سی لگتی تھی اور تمھارے قہقہے سن کر دور سے ہی ہانپنے لگتی تھی، اب وہی مدہم لڑکی بلند آواز سے روتی ہے اور گندی گالیاں بکتی ہے۔ میں نے اسے ڈپریشن کی مریضہ بنا دیا ہے۔ رات کو نیند کی گولی کھاتی ہے دن کو ڈپریشن کی، پھر اس کے بعد وہ اس قابل ہوتی ہے کہ بچوں کی ذمہ داریاں پوری کر سکے۔تم دونوں میں ایک قدر مشترک تھی تمھاری طرح وہ بھی مجھے چراغ کا جن سمجھتی تھی جس کے پاس دنیا کے ہر مسئلے کا حل ہوگا۔صوبی! تمھاری فرمائشیں پوری کر کر کے، تمھارے چہرے پر ہنسی بکھیر بکھیر کے میں بھی اپنے آپ کو بڑا جادوگر سمجھنے لگ گیا تھا۔ ۔مگر میں کیا نکلا؟ انسانوں کی قطار میں کھڑا ہو کر اپنے آپ کو جھوٹ کے عوض بیچنے والا غلام اور جانتی ہو کتنے ہی ان چاہے ہاتھ میری روح کو چھوتے ہیں اور میں اُف تک نہیں کرتا۔تو اس بدقسمت کی مایوسی اسی لئے اتنی گہری اور جائز ہے۔ وقت سے پہلے اڑان بھرنے کے چکر میں، اپنے آپ کو ماریہ کا مضبوط سہارا بنانے کے چکر میں، میں تو مارا گیا یار۔مگر افسوس یہ کہ جس کی خاطر موت کو گلے لگایا، زندگی اس کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔۔گندے کپڑے پہنے بال بکھرائے، روزمرہ کے کام کرتے کرتے اسکی آنکھوں سے خاموش آنسو بہتے رہتے ہیں، جیسے کسی کی مستقل موت ہو چکی ہو۔"

" کاش کوئی ایسا دروازہ ہوتا جس میں میں تم دونوں کو داخل کر دیتی اور وہاں یہ سب کچھ نہ ہوتا جو تم لوگوں کے ساتھ ہوا، وہاں ڈھولک کی تھاپ پر سہیلیوں کے گیت ہوتے، تمھارے گھر والے ماریہ کو محبت سے بیاہ کر لے کر جاتے تمھاری ماں اس کے چونچلے

اٹھاتی، وہ ہنستی کھیلتی تمھارے بڑے خاندانی گھر میں داخل ہوتی اور خوشی اس کا کشادہ ماتھا چوم لیتی، اس کی سیج خوبصورت اور خوشبودار پھولوں سے سجی ہوتی۔تم اس کو جی بھر کے محبت دیتے، اس کی ہر فرمائش پوری کرتے اور اس کی آنکھوں میں نا تمام خواہشوں کا روگ نہیں بلکہ تمھارے لئے عزت اور محبت ہوتی۔"

" سنو صوبی میں نے تمھیں کبھی ہچکیوں سے روتے نہیں دیکھا تھا، بہت پاکیزہ لگ رہی ہو، مگر میں کتنا آلودہ ہو گیا ہوں اور تم ویسے کی ویسے ہی ہو، آج بھی آنسو تمھارا چہرہ دھو دیتے ہیں، کاش تم ڈھیٹ ہو جاتی، کاش تم ہی بدل جاتی۔۔۔ہم تینوں میں سے کوئی ایک تو موت سے بچ جاتا۔"

"میں نہیں رو رہی۔۔اور تیرے لئے؟ تو کبھی بھی نہیں۔۔"

"جھوٹ بولنا کبھی نہ چھوڑنا، اتنی صدیوں بعد نہیں چھوڑا تو اب کیا چھوڑو گی۔۔۔

صوبی ایک بات مانو گی؟

بولو قیصر؟

"تم دکھی رہنا چھوڑ دو۔شادی کا فیصلہ ہو گیا، شادی ہو گئی اور بچے بھی ہو گئے، اتنا کچھ ہو گیا اور اب یہ سب undone نہیں ہو سکتا۔۔بس اسی سب کے ساتھ جینا سیکھ لو۔جیسے کسی کا کوئی پیارا مر جاتا ہے تو وہ ساتھ نہیں مرتے مگر روز یاد بھی نہیں کرتے بس اس دکھ کے ساتھ جینا سیکھ لیتے ہیں تم بھی اپنی موت کے ساتھ یہی کرو اور خدا کے واسطے اپنے مردے کے ساتھ جینا سیکھ لو۔۔"

"بس۔۔میں تمھیں دُکھی نہیں دیکھنا چاہتی، ہمیشہ کی طرح اس میں بھی میرا اپنا ہی لالچ ہے، تم دکھی ہوتے ہو تو کمزور سے لگتے ہو اور میں اپنا سائبان طاقتور دیکھنا چاہتی ہوں، جس میں میرا دکھ سنبھالنے کی طاقت ہو اور وہ بس HE Man ہو۔"

"صوبی سچ پوچھوتو اب زندگی سے کچھ لینا دینا نہیں , نہ خدا سے کچھ مانگنے کو دل کرتا ہے نہ جینے کے کسی سلیقے کو سیکھنے کو دل کرتا ہے۔اب تو بس ایک ہی خواہش باقی رہ گئی ہے کہ تمھاری ہتھیلی پر اپنا سر رکھ کے اتنا روؤں کہ سب دکھ اور یادیں اس طوفان میں بہہ جائیں ۔"

"اور قیصر میں ایک دفعہ بس تمھارے ساتھ بس ایک دفعہ،سورج نکلتے دیکھنا چاہتی ہوں اور اس کے بعد چاہے پوری دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شام ہوجائے اور کبھی کہیں کوئی سورج نہ نکلے "

"اور صوبی میں تمھارے ساتھ مل کر اپنے دکھ پر،تمھارے دکھ پر اور ہمارے دکھ پر رونا چاہتا ہوں،بس ایک دفعہ اور پھر چاہے میری زندگی کی شام ہوجائے۔"

" قیصر! دیکھو سب ختم ہوگیا مگر اس کے باوجود ہماری خواہشوں کی موت نہیں ہوئی۔۔"

جھوٹے وعدوں کی کرچیاں

زرق برق لباس پہنے عورتیں اور قیمتی سوٹوں میں ملبوس آدمی، ادھر اُدھر بھاگتے دوڑتے بچے، ان سب سے ہال بھرا ہوا تھا۔کینیڈا میں بھی پاکستانی انداز میں اعلی طبقے کا ایک روایتی سا فنکشن ہو رہا تھا۔اور حسبِ معمول میں، وہاں اپنے آپ کو مس فٹ محسوس کر رہی تھی۔ ہماری میز پر خاموشی کا راج تھا۔جیسے کسی بھی ایسی جگہ پر اجنبی لوگوں کی آپس میں گفتگو کے آغاز سے پہلے ہوتا ہے، سب لوگ ایک دوسرے کے کپڑوں کا، بالوں کے سٹائل کا، اٹھنے بیٹھنے کا خاموش جائزہ لیتے ہیں اور پھر دل ہی دل میں کچھ جانچ کر بات شروع کرتے ہیں یا پھر خاموش رہنے کا ہی فیصلہ کرتے ہیں۔

ہماری میز کی خاموشی کو سٹیج پر شروع ہونے والی تقریروں کے سلسلے نے توڑ دیا، خاموشی تو ٹوٹ گئی مگر اب تقریروں کی بوریت کی وجہ سے جمائیوں کا لا متناہی سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔۔ایک آدھ مقرر کی بات لوگوں کے دل میں اتری بھی مگر بور کرنے والوں کی اکثریت زیادہ تھی۔

اللہ اللہ کر کے کھانے کے لئے اعلان ہوا تو سب لوگوں کی زندگی کو مقصد مل گیا۔ مجھے اس سجے سجائے ہال میں پہلی بار خوشی کی لہر محسوس ہوئی۔ میرا پیٹ بھی بھوک کی اذان دے رہا تھا اسلئے کھانے کی نماز شکر کر کے ادا کی۔کھانا پیٹ بھر کے کھا چکنے کے بعد اب آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں تو میں اس بھاری بھرکم فنکشن سے نکلنے کا سوچنے لگی،

ابھی اٹھنے کا ارداہ باندھ ہی رہی تھی کہ سٹیج سے گانوں کا شور اٹھا۔یعنی تقریروں والی محفل اب گیت سنگیت میں تبدیل ہو چکی تھی۔مگر میوزک عورتوں کے زرق برق لباس کے عین مطابق خوب شور شرابے والا تھا۔

پھر اچانک میں نے محسوس کیا لوگ گلوکار کی طرف دیکھنے کی بجائے کہیں اور دیکھ رہے ہیں اور اکتائے ہوئے چہروں پر ایک بشاشت چمک رہی ہے۔ ہیں؟؟؟ ان سب مُردوں میں کیسے جان پڑ گئی، ان کی آنکھوں کی سمت دیکھا تو ایک ننھی سی تین یا چار سال کی گڑیا، خوبصورت شوخ رنگوں کی شلوار قمیض پہنے دنیا جہاں سے بے خبر میوزک کے ساتھ مست ڈانس کر رہی تھی۔اس کے انداز میں اتنی بے ساختگی اور کشش تھی کہ تقریباً سارے ہال کی آنکھیں اس ناچتی گاتی پری پر لگی ہوئی تھیں، مگر میں تو اس کو دیکھتے ہی کسی اور دنیا میں کھو گئی اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "اس بچی کو دیکھ کر میری تو اس فنکشن میں آنے کی کوفت ہی ختم ہو گئی ہے۔"

"اب ایسی بھی بات نہیں مٹن چاپس بھی بہت اچھی تھیں۔۔" ساتھ بیٹھی خاتون نے لقمہ دیا۔

میں نے فنکاری سے اس بے تکی بات کو نظر انداز کیا اور وقت ضائع کئے بغیر خاموشی سے اپنی نگاہیں اس بچی پر کچھ اس طرح ٹکا دیں کہ ہال کے باقی مناظر میری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہی ہو گئے۔اب میں تھی اور اس بچی کا دور سے روشنی دیتا ہوا چہرہ۔

تیز موسیقی ذہن کو متحرک کرے نہ کرے جسم کو کچھ نہ کچھ تحریک دے ہی دیتی ہے اسی لئے اب کئی جوڑے سٹیج کے پاس پہنچ کر ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے رقص کر رہے تھے۔مگر اس بچی کے جوش میں رتی برابر کمی نہیں آئی تھی۔اسی اعتماد کے ساتھ وہ سٹیج کی رونق بنی رہی۔اور میرے دل کو ایک خواہش عجیب سے طریقے سے جکڑنے لگی کہ کسی

طرح اس بچی کو گود میں اٹھا لوں۔اور اس کی گالوں پر چٹاخ پٹاخ بوسے دوں۔

وہ بچی انتہائی خاموشی سے میری انگلی تھامے مجھے ماضی کی گلی میں لے گئی تھی، جہاں میری گڑیا سارہ فراک پہنے کھڑی تھی اور ایسے ہی بے نیازی سے وہ میرے ساتھ چھلانگیں لگا رہی تھی، ہم دونوں بارش میں ڈانس کر رہی تھیں اور وہ میری لمبی قمیض میں گھس کر کہہ رہی تھی "اب مجھے پورے گھر کی سیر کراؤ۔" سارہ کی آواز میرے کانوں میں اتنی صاف سنائی دینے لگی کہ میں بھول ہی گئی کہ میں بہت سال آگے کو نکل آئی ہوں اور وہ مجھ سے بہت دور رہ گئی ہے۔اب مجھے یاد آ رہا تھا کہ میں کالج سے جتنی بھی تھکی ہاری آتی تھی اسے دیکھ کر سب تھکاوٹ بھاگ جاتی تھی۔سالوں پہلے والی وہی "تھکاوٹ بھاگ جانے والی کیفیت" اس اجنبی بچی کو دیکھ کر محسوس ہوئی۔ پتہ نہیں کون ہے وہ بچی جو سارہ کا دوسرا روپ لگ رہی ہے۔

سارہ تو اب ایک نوجوان لڑکی ہے، مگر جب میں پہلی دفعہ اسے چھوڑ کر ایک مہینے کے لئے بڑی بہن کے پاس دبئی گئی تھی تو وہ بھی اتنی ہی سی تھی، تین چار سال کی۔تب وہ میرے بغیر ایک مہینہ بھی نہیں رہ سکی تھی اور سخت بیمار پڑ گئی تھی۔اس ہال میں بیٹھ کر مجھے وہ چھوٹی سی سارہ نظر آ رہی تھی جسے میرے بہنوئی نے کمبل میں لپیٹ کر اٹھایا ہوا تھا۔ائیرپورٹ سے باہر نکلتے ہی اس کے بخار میں تپتے چہرے کو دیکھا تو میری چیخیں نکل گئیں۔اور میری بہن یعنی سارہ کی ماں، مجھے دیکھتے ہی غصے سے بولی تھی۔۔

"تو نے کیا میری بیٹی کو پیچھے لگایا ہوا ہے"؟ خود تو سیر سپاٹوں پر نکل گئی پیچھے یہ بیمار پڑ گئی"۔

میں نے جیسے اس کی ڈانٹ سنی ہی نہ ہو اور بے تابی سے اپنی سارہ کو گود میں بھر لیا تھا اور اسے کہا :"دیکھ میں تیرے لیے سونے کی بالیاں اور چاکلیٹ لائی ہوں" وہ کھلکھلا

کرہنس پڑی اور ساتھ ہی کسی کی آواز کانوں میں پڑی:

"لو اتنی سی کو سونے کی بالیاں ,اپنے جہیز کے لئے کچھ لے آنا تھا۔".

"جہیز؟ میں نے کون سی شادی کرنی ہے، میں نے تو بس اپنی سارہ کے پاس ہی رہنا ہے۔۔سارہ اور زور سے میرے ساتھ چمٹ گئی اور، بہن اور غصے سے بولی" دیکھا پھر میری گُڑی کو پاگل بنا رہی ہے۔"

سارہ کو پاس رکھنے کے لئے میری اور بہن کی لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ سارہ جب بھی میرے پاس آتی مَیں دنیا جہاں بھول کے اس کی ذات میں گم ہو جاتی، ہم اس کی ماں کی ڈانٹ کے باوجود بارش میں بھیگنے چلی جاتیں اور سارہ کے چہرے پر مسکان لانے کے لئے میں کچھ بھی کرتی اور اس کو اسکی ماں کی ڈانٹ ڈپٹ سے بچانے کے لییٔے جان پر کھیل جاتی۔ میری بہن غصے کی بہت تیز تھی۔ سارہ کے پیدا ہونے سے پہلے میں اس کا سامنا کرنے سے بھی بچتی تھی مگر سارہ کے پیدا ہونے کے بعد اسے ماں کے غیض وغضب سے بچانے کے لئے اب میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ مجھے سارہ کے چہرے پر بس خوشی دیکھنا ہوتی تھی۔ مگر میں شادی نہ کرنے اور ہمیشہ اس کے پاس رہنے کا وعدہ نہ نبھا سکی اور پھر اپنی نئی زندگی میں مصروف ہو کر دیکھ ہی نہ پائی کہ میری سارہ کے اندر کیا چلتا رہا تھا اور میرے بغیر جینے کی عادت ڈالنے کے لئے اس نے خود سے اور مجھ سے کیا کیا جھوٹ نہیں بولے تھے۔۔۔

"یہ بچی کون ہے؟" سٹیج پر ناچتی جھومتی بچی جو مجھے ماضی میں لے گئی تھی، حال میں بھی لے آئی۔ پتہ نہیں کیوں، مگر دل سے دعا نکلی کاش اس بچی کو کبھی کوئی چھوڑ کے نہ جائے، جیسے میں نے سارہ کو چھوڑ دیا تھا۔ کاش اس کے چہرے پر خوشیوں کی دھنک یوں ہی بکھری رہے۔

سارہ پیچھے ماضی میں کھڑی اداس اور بے یقین نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں لاہور ائیر پورٹ سے اپنے شوہر اور دو ننھے ننھے بچوں کو سینے سے چمٹائے اس سے نظریں ملائے بغیر اسے چھوڑ کے، اپنے نئے گھر کینیڈا جا رہی تھی۔ میں نے ایک دفعہ ڈرتے ڈرتے پیچھے مڑ کر اسے دیکھا اور اسی لمحے میرا وقت وہیں پتھر کا ہو گیا تھا۔ سارہ میری نظروں میں وہی چھ سال کی بچی کی صورت جم گئی تھی اسی لئے چودہ سال پرانے وقت سے نکل کر، اسی قد کاٹھ کے ساتھ، اسی چہرے کے ساتھ آج میرے سامنے ناچتی ہوئی گول گول گھوم رہی تھی۔

یادوں نے اور اپنی وعدہ خلافی نے دل درد سے بھر دیا اور آنکھیں چھلکنے ہی والی تھیں کہ اپنی میز کے باقی لوگوں سے آنکھیں چُرا کر اس ہال سے باہر نکل گئی۔۔ وہاں کھڑے نہ جانے کتنے سال بیت گئے کہ اچانک کوئی میری ٹانگوں سے آ کر لپٹ گیا" آنٹی مجھے شوز پہنا دیں"۔۔سارہ!! ایک دم میرے اندر کوئی زور سے چیخا.اس کے گول گول گدگدے ہاتھوں میں چھوٹی سی سینڈل پکڑی ہوئی تھی اور وہ اسے میری طرف بڑھا رہی تھی، میں دھندلائی آنکھوں کے ساتھ فوراً جھک کر اسے جوتے پہنانے لگی، ساتھ ہی ایک مردانہ آواز میرے قریب گونجی:

"یہ ہماری بڑی منتوں مرادوں والی بیٹی، اقراء ہے" میں چونک گئی" اوہ تو یہ سارہ نہیں، یہ تو سٹیج والی ڈانسنگ ڈول ہے۔" آپ پلیز اسے شوز نہ پہنائیں"، وہ شائد اس ڈانسنگ ڈول کے ابو تھے جن کی جیبوں سے ننگے پاؤں بھاگتی دوڑتی اقراء نے اپنے سینڈل نکال کر میرے حوالے کئے تھے۔

"اچھا اب پتہ چلا آپ کی تقریر اتنی اچھی کیوں تھی، کیونکہ جیب میں اقرا کے جوتے برکت کے لئے ڈالے ہوئے تھے؟ میں نے ہنستے ہوئے اقرا کے ابو کی تقریر کی

تعریف کی اور اقرا نے اپنے امی ابو کے منع کرنے کے باوجود جوتے مجھ سے ہی پہنوائے ۔

یہ تھی چودہ سال پہلے بچھڑنے والی سارہ سے میری کینیڈا میں پہلی ملاقات ۔ وہی چمکتی ذہین آنکھیں، ننھی منی ناک، گلابی ہونٹ، وہی باتیں وہی شرارتیں اور سب سے بڑھ کر میرے ساتھ چمٹنے کا وہی انداز۔ اب کی بار سارہ سے دور نہیں ہونگی ۔ میں نے دل ہی دل میں میرے کینیڈا آنے کے بعد سارہ کی مستقل شکایت کو سوچا" میرا بچپن تیرے بغیر ہی گذر گیا ہے" ۔

کیا وہ کھویا ہوا بچپن میرے سامنے دوبارہ جینے کو آ گیا ہے ۔ میں قدرت کے اس کرشمے پر حیران تھی ۔ کیا یہ مجھ پر قدرت کی کچھ خاص مہربانی ہے یا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس "یا" کا معمہ بعد میں کھل گیا۔ مجھے اس بچی میں کشش محسوس ہوتو ہو مگر حیران کن بات یہ تھی کہ وہ بچی بھی اسی شدت سے میری طرف مائل تھی ۔ کیا یہ اس "یا" کا کمال تھا؟ جس کے جواب کے لئے مجھے چودہ سال انتظار نہیں کرنا پڑا۔

اقرا کی اور میری کہانی سے پہلے سارہ کی اور میری کہانی کی یادوں کے کرب سے ابھی اور گذرنا پڑے گا۔ ہمیں کینیڈا آئے ابھی تین مہینے ہی ہوئے تھے کہ ہمارے پورے خاندان پر یہ خبر قیامت بن کر ٹوٹی کہ ننھی سارہ کی ماں کو دماغ کا کینسر ہے، پیروں تلے سے زمین نکل گئی، سر سے آسمان کھسک گیا تھا۔ کھانا، پینا، سونا حتی کہ جینا بوجھ لگنے لگ گیا تھا۔ زندگی ایسی بے مقصد اور ویران لگنے لگی کہ میرے شوہر نے میری حالت دیکھ کر مجھے پاکستان واپس بہن کے پاس بھیج دیا۔ تین مہینوں بعد ہی مجھے اپنے سامنے پا کر سارہ کی خوشی دیدنی تھی ، ماں کی بیماری کی شدت کی اس معصوم جان کو کوئی خبر نہیں تھی ۔ اسے تو میں مل گئی ۔ مگر میں اندر سے سہمی پڑی تھی ۔

بہن سے روتے روتے کہا" میں سارہ کو اپنے ساتھ رکھنے پر اب کبھی تم سے لڑائی

نہیں کروں گی، تمھاری قسم میں اسے ایک دن بھی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتی ۔"

"ہاہائے ۔۔۔تم لوگوں میں نجانے کتنا پیار تھا کہ میرا ہی درمیان سے کانٹا صاف ہوجائے گا۔۔ بہن نے روتی آنکھوں میں زبردستی کی مسکراہٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"تمھارے مقابلے میں میرا سارہ کے لئے پیار ایک پائی کا بھی نہیں , تم ہی تو کہتی ہو میں اسے بگاڑتی ہوں، دیکھو میں اسے بگاڑ دوں گی ، دیکھو! مجھ پر اعتبار نہ کرنا۔۔" میں نے دھمکی دی۔ مگر اس نے میری کسی بات کا یقین نہ کیا۔ پچھلے دو تین سالوں سے ہر دسمبر میں اس کی حالت بگڑ جاتی تھی ۔ میں ہر دفعہ سوچتی کچھ ہوگیا تو سارہ کے پاس کیسے پہنچ پاؤں گی؟ اتنی دور سے اسے کیسے سہارا دے پاؤں گی؟

پھر ایک منحوس دسمبر آیا اور میں حسبِ معمول پاکستان چلی گئی، بہن بے حس وحرکت پڑی تھی ۔ اس کا پورا جسم مفلوج ہو چکا تھا مگر شائد اس دن 14 دسمبر کو اس کا صرف دل کام کر رہا تھا، میں صبح کے چار بجے پاکستان پہنچی تھی ۔ بہن کو اس حال میں دیکھ کر اللہ سے بہت دعا کی کاش وہ ایک دفعہ آنکھ کھول دے اور مجھے دیکھ لے کوئی ایک انگلی کی حرکت سے مجھے دل کی کوئی بات بتا دے ۔ مگر اس نے نہ کچھ کہا، نہ آنکھیں کھولیں بس شائد کمرے میں میری موجودگی کو محسوس کیا اور سارہ کو میرے حوالے کر کے دنیا سے منہ موڑ گئی ۔ میں سارہ کے پاس اس کی زندگی کے سب سے کٹھن مرحلے میں پہنچ چکی تھی اور اس کی ماں اس یقین کے ساتھ چلی گئی تھی کہ میں اسے اس کڑے وقت میں سنبھال لوں گی اسی لئے اس نے اسی دن شام چار بجے اس دنیا کو الوادع کہہ دیا تھا۔

اور جب سفید کفن اور لال دوپٹے میں لپٹی بہن کو چار آدمی کاندھوں پر اٹھائے نعرہ تکبیر کہتے لے گئے تو میں اس کے پیچھے بھاگی تھی ، میں نے چیخ چیخ کر اسے بتانا چاہا کہ " خدا کے واسطے میرے ساتھ یہ ظلم نہ کرو ، میں سارہ کو نہیں سنبھال سکتی ، ایک دن بھی نہیں ۔۔ خدا

کی قسم رک جاؤ۔۔" مگر میری چیخ ابکائی کی صورت نکل گئی اور اس تک کوئی آواز نہ گئی۔اور وہ انتہائی اعتماد سے اپنی بیٹی سے پیار کرنے کی سزا مجھے سنا کر چلی گئی، "لو سنبھالو اسے" ۔لگتا تھا ہر طرف بین ڈالتی عورتیں یہی کہہ رہی ہیں" سنبھالو سارہ کو" میں نے بے بسی سے سارہ کو ساتھ لگایا وہ برف کا تودہ بنی کھڑی تھی، ہم جو اکٹھے ساتھ رہنے کے لئے اس کی ماں سے جھگڑا کرتی تھیں، اب ایک دوسرے کو تھامے ایک دوسرے کو محسوس کرنے کی طاقت بھی کھو چکی تھیں۔

آج فنکشن سے گھر آتے ہی سارہ کو اقراء کے بارے بڑے جوش وخروش سے بتایا" سارہ بالکل تیری طرح مجھے چمٹ گئی"۔۔

"اچھا خالہ۔۔بُجھی بُجھی سی آواز۔۔او!! میں چونکی، بہن کے جانے کے بعد ایک احساسِ جرم مجھے ہمیشہ گھیرے رکھتا تھا، میں اپنے بچوں کے ساتھ ہوں بہن ٹھیک کہتی تھی میں اس کی گُڑی کو پاگل بنا رہی تھی۔

"بس خالہ اب اسے بھی نہ ساتھ چمٹا لینا۔۔سارہ کا میرے لیئے احساسِ ملکیت بولا ۔۔

"نہیں نہیں کیوں چمٹانا ہے؟ وہ کون سا خون کا رشتہ ہے؟"

"تمھارے والی بات تو نہیں نا۔" میں خوامخواہ اپنا دفاع کرنے لگ گئی، تم تو میری اپنی بہن کی بیٹی تھی، اور جب تو دنیا میں آئی تو میری شادی نہیں ہوئی ہوئی تھی، میرے پاس کون سا کوئی بچہ تھا۔اور تو نے مجھے میرے اپنے بچوں سے بھی پہلے ماں بنایا تھا اور اب تو میرے اپنے بچے، میرا بچونگڑوں سے دل بھر گیا ہے۔"

پتہ نہیں یہ سب میں سارہ سے کہہ رہی تھی یا خود کو سمجھا رہی تھی یا اس بچی سے اپنے آپ کو دور رہنے کا مشورہ دے رہی تھی۔

مگر ہوا یوں کہ میں اس بچی سے اپنے آپ کو دور نہ رکھ سکی۔اور سارہ کے ساتھ کیا گیا ایک اور وعدہ توڑ دیا۔وہ بچی جہاں بھی ملتی مجھے اس کے اندر ایک بے نام سی کشش محسوس ہوتی۔وہ بھی سب ہجوم کو چھوڑ کر میرا ہاتھ تھام لیتی، میری گود میں چڑھنے کی ضد کرنے لگتی۔ اس کی امی کی آنکھوں میں مجھے اپنے لئے ایک کھنچاؤ سا محسوس ہونے لگا۔بالکل ویسا ہی جیسا میری بہن کی آنکھوں میں اس وقت آتا تھا جب سارہ میرے پیچھے پیچھے بھاگتی تھی۔سارہ کی ماں میری اپنی بہن تھی میں اس سے ضد کر کے، لڑائی کر کے سارہ کو پاس رکھ لیتی تھی۔ اقرا کی ماں، ایک تو بہن نہیں تھی دوسرا بہن کے ساتھ ضد کرنے کی بہت بڑی سزا بھگت چکی تھی۔یہ کوئی گڑیاؤں کا کھیل نہیں تھا۔یہ زندگی تھی اور یہ بچیاں جیتی جاگتی لڑکیاں ہیں میری گڑیاں نہیں ہیں۔وہ لڑکیاں جنہیں بس اپنی ماؤں کے پاس ہی رہنا چاہیئے۔اور جن کی ماؤں کو ان کے پاس ہی رہنا چاہیئے۔میں محتاط رہنے کی کوشش کرتی، مگر اقرا کی پانچ سالہ زندگی میں کوئی ایسا کڑوا تجربہ نہیں تھا۔وہ تو بس دل کی بات پر ڈانس کرتی میری طرف بڑھتی رہی۔

"آنٹی میں تو بس احمد سے ہی شادی کروں گی۔میرے بیٹے کے ساتھ کھیلتے کھیلتے وہ دل کی خواہش نہ صرف مجھے بلکہ اپنے ماں باپ کو بھی بتا دیتی۔۔اور ہم سب اسکی سادگی پر ہنس پڑتے۔میرا بیٹا احمد جو اقراء سے عمر میں ایک سال بڑا تھا، شرما کر رہ جاتا۔اب کیسے اقرا سے دور ہوں اب تو ماں باپ بھی دوست بن گئے اور بچے آپس میں دو جسم ایک قلب بن کر گھوم رہے ہیں، میری احتیاط دھری کی دھری رہ گئی۔۔ابھی میں اسے ساتھ چمٹانے سے بچ رہی تھی کہ" یا" درمیان میں آ گیا۔۔۔۔ایک دفعہ پھر زمین آسمان ہل گئے۔" اقراء کی امی کو جگر کا کینسر ہو گیا ہے۔"۔یہ خبر نہ تھی ایک بم تھا جو ساعت پر پھٹا۔

"یہ تو برین ٹیومر کی طرح خطرناک نہیں ہوتا؟ اس کا تو علاج ہوتا ہوگا، اچھا نہیں بھی

ہوتا ہوگا تو اقراء کے جوان ہونے تک تو بہت سال مل جائیں گے نا، جیسے میری بہن کو سارہ کے جوان ہونے تک مل گئے تھے؟"

میرے ان تمام سوالوں کے جواب منفی میں نکلنے لگے اور خوف میرے معدے میں آ کر ٹھہر سا گیا۔سوچا اقراء سے دور بھاگ جاؤں، تقدیر سے بھڑ جاؤں مگر اقراء سارہ کی طرح محبت میں پرعزم بھاگ بھاگ کے میرے پاس آنے لگ گئی دوسری طرف اس کی امی کی آنکھوں میں بھی ایک کھو دینے کا کرب نظر آنے لگ گیا۔وہ بہن کی طرح منہ سے نہ کہتی تھی مگر جب اقرا بھاگ کر میری طرف آتی یا میرے ساتھ کھڑی ہوتی اور ماں بلاتی تو وہ نہ جاتی، تو اسکی آنکھیں کہتی نظر آتیں۔۔

"میری بیٹی کو چھین لیا مجھ سے" اور میں عادی چوروں کی طرح اس کی آنکھیں دیکھتے ہی اپنی صفائیاں دینے لگ جاتی۔

"ماں کے علاوہ بچے کسی کے نہیں ہوتے۔۔ماں کے علاوہ کوئی بچوں کو نہیں سنبھال سکتا"۔اور میرے اندر میرا پرانا خوف چیخنے لگتا اور دل کرتا اس خوف کو زبان دے دوں اس کو کہوں" بی بی! کان کھول کے سن لو، خبردار! جو مرنے کا سوچا بھی تو"۔

مگر میرا حلق پہلے ہی خشک ہو جاتا اور باقی کے رسمی دفاعی الفاظ بھی ساتھ چھوڑ دیتے تھے اور میں بس سوچتی ان ماں بیٹی سے کہیں دور بھاگ جاؤں۔مگر کوئی مجھے بھاگنے بھی تو دے۔۔

"آپ اسے کیمو میں ساتھ لے کر نہ جایا کریں، اس کا کیا قصور ہے اس عمر میں یہ بیماری دیکھے، ہسپتال دیکھے۔۔میں ساری احتیاط کے باوجود، اقراء سے دور بھاگنے کی خواہش کے باوجود، ایک دفعہ پھر سے اپنا پرانا انجام بھول کر، سارہ کا بچپن بچانے، اسے خوشیوں سے بھرنے کے لئے، اس کے چہرے پر خوشی کی دھنک بکھیرنے کے لئے، اسی کی

ماں کے ساتھ ضد لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"نہیں یہ میرے ساتھ ہی رہے، سب کچھ دیکھے۔" اقراء کی ماں کے لہجے میں ممتا بولتی جو جانتی ہے کہ ہسپتال میں بچی کو ساتھ لے جانا ٹھیک نہیں مگر جو خود غرض بھی ہوتی ہے کہ میری بیٹی میرے پاس زیادہ سے زیادہ رہے۔اقراء کی ماں میری سگی بہن نہیں تھی اس سے لڑائی نہ کر سکتی تھی، خاموش ہو جاتی۔مگر پھر اقراء کسی نہ کسی طرح مجھ تک پہنچ ہی جاتی تھی۔اور آتے ہی سارہ کی آواز میں بولتی:

"دیکھو میں پھر آ گئی۔۔"

میں کشمکش میں پڑ جاتی "اس سے دور بھاگوں یا اس کی طرف بھاگوں؟"

پھر فیصلہ اس کی طرف بھاگنے میں ہی ہوتا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے کام مجھے باندھ لیتے اور اس کی مسکراہٹ کی خاطر اس کی ماں کی شکایت بھری نظروں کو نظر انداز کرنے کی ہمت آ جاتی۔مگر اس کے باوجود روز ایک سوال میرے سامنے آ کھڑا ہوتا۔

" کیا اقراء کی ماں جگر کے کینسر سے بچ جائے گی؟"

"ہاں اسے بچنا ہی ہوگا , اس دفعہ کوئی میرے بھروسے اپنی بچی چھوڑ کر میری آنکھوں کے سامنے یوں دھڑلے سے نہیں جائے گا,میں صاف انکار کر دوں گی، میں صاف انکار کر رہی ہوں۔اپنی بچیاں سنبھال کے رکھو، مجھے کسی کی بچی سے کوئی پیار نہیں۔کوئی میری ٹانگوں سے آ کر نہ لپٹے، اپنی اپنی بچیوں کو خود ہی جوتیاں پہناؤ، ان کے کام کرو، ان کے ساتھ کھیلو۔۔خدا کے واسطے مجھے شکایت بھری نظروں سے نہ دیکھو۔میرا یقین کرو کوئی مائی کا لال دنیا میں کسی ماں کی جگہ نہیں لے سکتا۔کوئی کسی کے بچے کو نہیں پال سکتا۔۔یقین کرو میرا۔مجھ پر شک نہ کرو کہ میں تمھاری بیٹیاں چھین رہی ہوں۔۔سنبھالو اپنی بیٹیوں کو۔۔۔'

میں چلاتی رہ گئی۔مگر سارہ کی ماں کی طرح اقراء کی ماں نے بھی میری ایک نہ

سنی۔۔۔

میں اس گمان میں تھی کہ اقراء کی ماں کے پاس ابھی کچھ سال تو ہیں اور یہ کینیڈا ہے۔ اچھے سے اچھا علاج ہوگا۔ سارہ کی ماں تو پاکستان میں تھی، وہاں اتنی سہولتیں نہیں ہیں اسلئے یہاں کچھ نہیں ہوگا مگر سب خوش فہمیاں دھری کی دھری رہ گئیں اور ایک دن دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو اقراء کے ابو اسے ہاتھوں میں اٹھائے میرے در پر سر جھکائے کھڑے تھے، میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا، ان کے بولنے سے پہلے ہی میری نظر گاڑی میں بیٹھی نڈھال، موت کے بالکل قریب، اقراء کی امی پر پڑی۔ وہ آنکھیں جن میں میرے لئے خاموش شکایتوں کا ایک کرب نظر آتا رہتا تھا آج اعتماد سے بھری ایک بھیک تھی، خاموش شکایت کی طرح خاموش بھیک۔۔ میری بیٹی کو سنبھال لینا ۔۔۔ میں نے اس کے پاس جا کر کہا" طبیعت کیسی ہے؟"

خاموش آواز سے بولی۔"نہیں ٹھیک، بہت درد ہو رہا ہے۔"۔ اور آنکھوں میں ایسی تھکاوٹ تھی جیسے کوئی بہت دور سے مسافت طے کر کے آیا ہو یا کوئی لمبی جنگ کے بعد ہتھیار ڈال دے۔ اب ایک دفعہ پھر سے مجھ میں ہتھیار ڈالی آنکھیں دیکھنے کی سکت نہیں تھی۔

آنے والے وقت کے خوف سے میرا اندر کانپنے لگا، دل کیا اسی وقت ان کی بیٹی ان کو واپس کر دوں اور کھری کھری سناؤں" لے جاؤ اپنی بیٹی کو میں نہیں سنبھال سکتی، کیا لگتی ہوں میں تمھاری؟ کیا لگتی ہے یہ میری؟ میں تو تمھاری بیٹی کو چھین رہی تھی نا خدا کے واسطے اس خوف کو مت جھٹلاؤ، وہ سچا خوف تھا۔۔ مجھ پر اتنا اعتماد نہ کرو۔۔ خدا کے واسطے اپنی بیٹی کو لے جاؤ۔۔ کوئی بھلا ایسے بھی اپنی بیٹی کسی کے حوالے کر کے جاتا ہے۔ میرا اس سے کوئی خون کا رشتہ نہیں۔۔ سن لو میری بات۔۔ مت جاؤ اپنی بیٹی کو چھوڑ کے، مت جاؤ"۔

مگر وہ بیٹی کو میرے حوالے کرتے ہی یوں اطمینان سے ہسپتال کی طرف چلی گئی جیسے اب اس کو کوئی درد نہیں ہو رہا۔

اور اقرا خوشی سے میری ٹانگوں سے چمٹی نہیں جانتی کہ اس ننھی سی عمر میں وہ کتنے بڑے حادثے سے دوچار ہونے والی ہے۔ ماں بھی مطمئن ہو کے چلی گئی، بیٹی بھی خوش ہے۔ اور میرے پاس اب اس کے علاوہ سوچنے کے لئے کوئی اور چارہ نہیں کہ اقرا کے چہرے کی خوشی کو یہیں پر (preserve) حنوط کر لوں۔ مگر ایک دو دن بعد ہی اقرا کے ابو کا فون آ گیا،

" آپ اقرا کو ہسپتال لے آئیں تا کہ وہ اپنی امی سے مل لے۔"

"ہسپتال آنا ضروری ہے؟" میں ابھی بھی اقرا کو بیماری کی بدصورتی اور ظلم سے بچانا چاہ رہی تھی۔۔

"ہاں جی، شائد یہ آخری ملاقات ہو!!" ابو کا دکھ میں ڈوبا دوٹوک جواب آیا اور میں شکست کھائے جواری کی طرح اقراء کو لے کر ہسپتال پہنچ گئی۔ اقرا کے چہرے پر خوشی کے رنگ بسائے رکھنے کا جوا، جس کے لئے میں نے اپنی ذاتی زندگی، بچے، شوہر، معاشرہ اور لوگوں کی باتیں سب کو داؤ پر لگایا ہوا تھا، وہ جوا میں ہار چکی تھی۔

اور سارہ کی ماں ایک دفعہ پھر میرے سامنے آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ نقاہت اتنی کہ آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ اقرا کی امی اسے میرے ساتھ چمٹتے دیکھ کر پھر سے مجھ سے ناراض نہ ہو جائے یا بہت زیادہ مطمئن نہ ہو جائے انہی سوچوں میں گم میں پردے کے پیچھے چھپی کھڑی تھی۔ اقراء کو کہا جا رہا تھا امی کا منہ چومو، وہ بیماری کے ہاتھوں شکست کھائی ماں کا چہرہ دیکھ کر خوفزدہ تھی۔۔

اس نے کہا"نہیں چوموں گی"، پھر میری طرف مڑ کر بولی" آنٹی آپ چومیں۔۔"

کاش مجھے اقراء اور سارہ کو انکار کرنا آتا ہوتا۔۔ مگر نہیں، اسی لئے میں نے بڑھ کر اس کی ماں کی گال پر بوسہ دیا۔ بند آنکھوں کے پیچھے سے شائد اس نے مجھے اور میرے بوسے کو محسوس کیا۔ اور مجھ سے پوچھا،

"اقرا ٹھیک ہے؟

ہاں بہت ٹھیک ہے تم فکر نہ کرو۔۔" اب سوچتی ہوں یہ رسمی تسلی بھی دینے کی کیا تک تھی، مجھے تب ہی کہنا چاہیئے تھا؛

"مجھ پر اعتبار نہ کرنا میں تو تمھاری بیٹی کو چھین لوں گی، اتنی قیمتی بیٹیاں پیدا کر کے۔ ان کو ایسے پیار سے پال کے کہ کسی اور کا سایہ بھی نہ پڑے اب ایسے کیسے تم اتنی لا پرواہی سے اسے دنیا میں تنہا چھوڑ کر جا سکتی ہو؟ کہاں گیا تمھارا اپنی اکلوتی مہنگی بیٹی کے لئے possession، مت کرو ایسے۔۔" مجھے اسے کھری کھری سنانی چاہیئے تھی، ایسا کرتی تو شائد وہ رُک جاتی۔

مگر 13 ستمبر کو اسی طرح، شام 4 بجے سارہ کی ماں دوبارہ میرے ہاتھ میں پانچ سال کی سارہ کا ہاتھ تھما کر اطمینان سے دنیا کو الوادع کہہ گئی۔

اور میں ایک دفعہ پھر سے ہکا بکا ایک اور ماں کو خاموشی اور بے بسی سے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

ہم سوچ ہی رہے تھے کہ اقراء کو کیسے سنبھالیں، ہمیں اس کی آوازیں سنائی دینے لگیں کبھی وہ اپنی سکول ٹیچر کو میرا تعارف کرواتے ہوئے کہتی تھی" یہ میری ماما ہے"، اور کبھی سوئمنگ انسٹرکٹر کو بتاتی تھی،

"یہ میری آنٹی نہیں ماما ہے"۔

احمد کو بھی اب دلہا نہیں اپنا بھائی کہنے لگ گئی تھی۔ کیونکہ اسے پتہ ہے جب ماں

ایک ہوتی ہے تو سب بچے بہن بھائی ہوتے ہیں۔۔ اس کی ٹیچر نے بتایا کہ یہ اپنی پیدائش کی سٹوری بتاتی ہے کہ میں روبینہ ماما کے پیٹ میں تھی، پھر عظمیٰ ماما نے مجھے ان سے ادھار لے لیا اور اب میں دوبارہ اپنی اصلی ماما کے پاس آ گئی ہوں۔

وہ اس جھوٹ میں اتنا حقیقت کا رنگ بھر چکی تھی کہ مجھ سمیت سب کو یہی سچ لگنے لگ گیا تھا۔ اور ہم سب یہ سمجھ کر مطمئن تھے کہ اقرا حالات سے سمجھوتہ کر چکی ہے۔

وہ ماں کے نہ ہونے کو ایک عیب سمجھ کر چھپاتی تھی۔ اس کے ابو کو کوئی بھی فنکشن اٹینڈ کرنا ہوتا تھا میں اقرا کی خاطر ساتھ جاتی، احمد کو بھی ساتھ لے کے نہیں جاتی کہ وہاں اقراء کو ایک پوری ماں جو صرف اسے توجہ دے، چاہیئے ہوتی تھی۔ وہاں وہ دوسرے بچوں کو دکھانے کے لئے میری گود میں آ کر چھپ جاتی تھی۔ جان جان کر اپنی ننھی منی سہیلیوں کو میرے پاس لاتی تھی اور مجھ سے ان کی شکایتیں لگاتی تھی اور پھر اعتماد سے مجھے دیکھتی تھی جیسے میں اس کو سب مسئلوں سے نکال لوں گی اور میں دنیا کی وہ واحد ہستی ہوں جو اس کی ماں ہے، اور اس کے اوپر کوئی گرم ہوا نہیں پڑنے دوں گی۔ جو اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑے گی۔۔

ایک دن میرے ساتھ بیٹھ کر ستارے دیکھ رہی تھی۔ ہم ستاروں میں اس کی ماں ڈھونڈ رہے تھے اور میں اسے بچی سمجھ کر بہلا رہی تھی اور اس نے مجھے بڑے اعتماد سے کہا "بس آپ میری ماما ہیں۔ مگر آپ نے کبھی مرنا نہیں"۔۔ میں حیرت سے گنگ اسے دیکھتی رہ گئی اور کانپ گئی تھی کہ میرا تو وعدے نبھانے کا ریکارڈ بہت گندا ہے۔۔ مگر پھر بھی میں نے اسے تسلی دی، اس کے چہرے پر وقتی خوشی کے رنگ بکھیرنے کو بڑے عزم سے کہا۔۔ "اقرا میں تمھیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔۔ تم میری بیٹی ہو، میرے پیٹ سے نکلی ہو، کوئی ہمیں الگ نہیں کر سکتا۔۔"

کچھ تو میرا مان رکھا ہوتا مگر نہیں تقدیر نے میرا یہ وعدہ بھی جھوٹا کر دیا۔ اقرا کے ابو

کی پاکستان ٹرانسفر کی خبر میری سماعت پر کسی بم کی طرح پھٹی۔۔ میں جو یہ سمجھ کر سکون سے بیٹھی تھی کہ سارہ کا گمشدہ بچپن اقرا میں دیکھوں گی، سب وعدہ خلافیوں کی تلافی کر دوں گی ۔میں اپنی اور اقرا کی آپسی کشش کو خدا کی مستقبل کی پلاننگ سمجھ کر مطمئن تھی کہ اس "یا" کا جواب شائد اسی میں تھا کہ اقرا کی ماں کو جانا تھا اور اسے میں نے پالنا تھا۔۔اسی لئے خدا نے ہم دونوں کے دل ایک دوسرے کی محبت سے بھر دئے تھے۔۔مگر سب خیالی محل دھڑام سے زمین پر گر گئے۔سارہ پھر سے اکیلی ہونے جا رہی تھی۔۔۔۔میرے دل میں جدائی کا ایک اور گھاؤ لگنے والا تھا اور میرا ایک اور وعدہ ٹوٹنے جا رہا تھا۔۔

آج کینیڈا میں اقراء کا آخری دن ہے۔میں اسے میکڈونلڈ کھلانے لے کے جا رہی ہوں۔ایکدم سے میرے گلے لگ کے رونے لگ گئی ہے۔پانچ سال کی بچی، اپنی ماں کی لاش سے لپٹ کر بھی ایسے ہی روئی تھی۔سب حیران رہ گئے تھے کہ اتنی سی بچی کو کیسے موت پر رونا آتا ہے اور میں اب بھی حیران رہ گئی ہوں۔۔ہم نے اپنی طرف سے اس سے مستقل جانے کی خبر یہ کہہ کر چھپائی ہے کہ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں پاکستان اپنے نانا، نانی اور دادی کو ملنے جا رہی ہے۔۔"اقرا چھٹیوں کے بعد آجاؤ گی آپ۔۔"

" تو پھر آپ ہمارے ساتھ چلیں۔۔۔۔وہ روتے روتے کہتی ہے۔۔" میں بعد میں آؤں گی۔" ۔میں آنسو ضبط کرتے ہوئے کہتی ہوں۔

میرے اس جواب کو سن کے وہ ایک دم روتے روتے چپ کر گئی ہے:

" ماما آپ کو ایک سیکرٹ بتاؤں۔اور ساتھ ہی خوفزدہ نظروں سے ساتھ بیٹھے احمد کو دیکھتی ہے جیسے کوئی بہت بڑا گناہ چھپانا مقصود ہو۔۔۔

"بولو اقرا۔۔" میں اسے سینے سے چمٹاتے ہوئے کہتی ہوں۔۔

"احمد کو نہیں بتانا، کسی کو بھی نہیں بتانا۔۔۔۔۔۔۔"

" کسی کو نہیں بتاؤں گی۔۔" میں ایک اور جھوٹا وعدہ کرتی ہوں۔

" آپ میری ماما نہیں ہیں، میرے پاس صرف ابو ہیں۔۔۔۔۔"

" نہیں اقراء۔۔" میں ٹوٹی ہوئی آواز میں کسی مرتے ہوئے شخص کی طرح بولتی ہوں۔

"ہاں ماما" وہ بڑے مضبوط انداز سے مجھے دیکھتے ہوئے کہتی ہے جیسے اب بحث کی گنجائش نہ ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اور پھر وہ زندگی میں پہلی دفعہ میرا لایا ہوا برگر کھانے سے انکار کر رہی ہے۔۔۔۔۔۔۔

اور پھر ائیر پورٹ کے آخری دروازے کے اندر داخل ہوتے اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو "ماما، جو جھوٹ میں نے اپنے آپ کو بہلانے کے لئے بولا تھا، اس کی مدت ختم ہو گئی ہے۔"

مجھے وعدے توڑنے کی سزا تو ملنی ہی چاہیئے تھی۔جن چہروں پر خوشی دیکھنے کے لئے ان کی ماؤں سے ضدیں لگاتی تھی، وہ چہرے دنیا کی بھیڑ میں اکیلے چھوڑ دیئے۔۔سارہ کا بچپن میرے بغیر گذر گیا تھا، اقراء بھی اپنا بچپن میرے بغیر گذار نے ائیر پورٹ کے آخری دروازے میں داخل ہو گئی ہے اور اس کی آنکھوں میں ان تمام جھوٹے وعدوں کی کرچیاں نظر آ رہی ہیں، جنہیں اب ساری عمر میرے جسم میں چبھنا ہے۔

کینیڈا کی لڑکیاں۔۔اُوں ہوں!!

کینیڈا میں آئے ہیں تو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ شرم وحیا ہی بھول جائیں اور اپنی ثقافت اور مذہب چھوڑ دیں۔۔کیڑے پڑیں میری نند کو۔رخسانہ اتنا تُرش بول رہی تھی کہ کھانا اس کے حلق میں مرچیں بھر رہا تھا اور اتنا تیز بول رہی تھی کہ کمرے میں موجود سب خواتین اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور نظر آتی تھیں۔ویسے تو آہستہ بولنا اس کی سرشت میں ہی نہیں تھا۔مگر آج تو اس کا دل غم اور غصے سے پھٹا جا رہا تھا اسلئے آواز کا پھٹنا بھی فطری تھا۔

جو عورتیں اس کے مزاج سے واقف تھیں انہوں نے نہایت تابعداری سے سر کو زور زور سے اس کی بات کی تائید میں ہلانے میں ہی عافیت جانی۔کچھ کا تو رخسانہ کی دہشت سے سر ایسا بے ساختہ اور بے لگام ہلنا شروع ہوا کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔رخسانہ کی ہاں میں ہاں نہ ملانے یا ہلکی آواز میں تائید کرنے کا مطلب آدھی موت تھا،اور پوری موت اس صورت آتی جب کوئی اس کی رائے سے اختلاف کرنے کی گستاخی کر بیٹھتا۔یہ ہمت نہ اس کے شوہر کو تھی نہ جوان بچوں کو،اور نہ بچاری سٹریٹ کی ان معصوم عورتوں کو،اور یہ عورتیں رخسانہ کی غیر موجودگی میں اکثر اس بات پر حیرت کا اظہار کرتی تھیں اور رشک میں مبتلا رہتی تھیں کہ اس کے پاس کون سا ایسا گُر ہے کہ میٹرک فیل ہونے کے باوجود کینیڈا جیسے ملک میں رہتے ہوئے،شوہر اور بچوں کو ایسی نکیل ڈال کے رکھی ہوئی ہے کہ اس کے سامنے دم مارنے

کی جرأت نہیں کرتے۔کینیڈا میں شوہروں کا بیویوں کی غلامی کرنا تو کوئی ایسی اچنبھے کی بات نہیں تھی مگر بچے۔۔۔؟ وہ بھی یہاں کے سکولوں کے پڑھے ہوئے، جہاں" کے جی" سے ہی بچوں کو سکھایا جاتا ہے کہ ماں باپ اونچی آواز میں بات بھی کریں تو 911 ملانا ہے اور بس ۔۔آگے اللہ اللہ خیر صلا۔۔مگر رخسانہ کے بچے کھانے پینے، دوستوں سے ملنے، نوکری کرنے یا کچھ بھی کرنے کے لئے ماں کی اجازت کے بغیر پر بھی نہیں مارتے تھے۔عورتوں نے کئی دفعہ حیلے بہانے سے رخسانہ سے یا اس کے بچوں سے اس " تابعداری" کا راز اگلوانے کی کوشش کی مگر رخسانہ نے ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ" بس میں نے اپنے بچوں کی تربیت کے لئے دن رات محنت کی اس لئے خدا نے مجھے یہ صلہ دیا ہے" اور پوچھنے والیاں یہی سوچتی رہ جاتیں کہ " ہائے ہائے ہماری تربیت میں کیا کمی رہ گئی کہ بچے بات سن کے ہی نہیں دیتے، دوستوں کے انتخاب اور نوکریوں کے مشورے تو دور کی بات وہ تو کھانا تک ان کی مرضی سے نہیں کھاتے تھے۔"

اور رخسانہ کے بچوں کے جوابات سے مل جل کر یہ اندازہ لگایا گیا کہ "امی حضور روئی کی طرح دھنکنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگاتیں"، الجھن وہیں کی وہیں کھڑی رہتی کہ بچے اس ملک میں رہ کر اور اتنے بڑے ہو کر کیسے چپ کر کے مار کھاتے اور پھر تابعدار بھی رہتے۔۔۔

اور آج اس کے منہ سے اپنی ہی نند کے بارے میں کلمات سن کر مریم کے گھر اکٹھی ہونی والی عورتیں دم بخود رہ گئیں۔۔اب بات پتہ نہیں کدھر کو نکل جائے۔۔؟ سب کی آنکھوں میں گھبراہٹ بھرا سوال ابھر آیا تھا۔

ایک نئی خاتون جو ابھی ابھی اس سٹریٹ میں موو ہوئی تھی، اس نے اپنی غفلت میں سوال کو الفاظ دے دئے۔۔

کیا ہوا آپ کی نند کو۔۔؟

رخسانہ نے پہلے تو سوال کرنے والی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا، کیونکہ پرانی عورتوں نے تو اس کی بات کو نظر انداز کر دینا تھا اور کوئی اور موضوع چھیڑ دینا تھا۔

"یہ نہ پوچھو کیا ہوا، یہ پوچھو اس نے کیا کیا؟ ارے ہندو سے شادی کر لی ایسی ناہنجار نکلی، میرے شوہر تو خاندان میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گئے۔۔"

"اوہ یہ تو بہت افسوس کی بات ہے۔۔" سب خواتین نے نند کی اس حرکت پر مل کر مجبوراً خوب لعنت ملامت کی۔۔

نئی خاتون شائد کینیڈا کے رنگ میں کچھ زیادہ ہی رنگ چکی تھی ,بڑی معصومیت سے بولیں۔۔

"تو پھر کیا ہوا ان کی زندگی ہے، اگر انہوں نے ہندو سے شادی کر لی، آخر کچھ تو سوچا ہوگا۔۔"

اب رخسانہ کی آنکھوں میں انگارے بھر گئے۔۔"نام کیا ہے آپ کا بی بی۔۔؟

"میرا۔۔۔" ابھی وہ خاتون بولنے ہی لگیں تو رخسانہ ایسے تیز لہجے میں بولی کہ اس خاتون کی آواز گلے میں ہی دب گئی اور اسکی جگہ ایک ہلکی سی سیٹی سی نکل گئی۔۔

"اچھا پھر یہاں کی ہکڑ اور پاکستان کی ہکڑ میں کیا فرق رہ گیا ہے۔۔۔ بولیں ذرا ۔۔کیا نام ہے آپ کا۔"

"صدیقہ۔۔۔" میزبان نے جلدی سے اس غریب کا نام بتا دیا۔۔

"ہکڑ کیا؟ صدیقہ کی سادگی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔۔ یا وہ hooker کو سمجھنا نہیں چاہ رہی تھی، رخسانہ "ر" پکی لاہوری ہونے کی وجہ سے لڑھکتی تھی۔۔اس لئے اس خاتون کو لگا کہ "نہیں نہیں اس نے وہ نہیں کہا ہوگا۔۔۔"

کمرے میں موجود زیادہ تر خواتین اپنی ہنسی چھپانے کی کوشش میں ادھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔۔

ایک نے بات بدلنے کے لئے آج کی دعوت میں موجود کھانوں کی تعریف کی کوشش کی۔۔

"مٹن قورمہ بہت مزے کا تھا کس نے بنایا تھا۔۔"

دوسری اس سے بھی زیادہ تیزی سے بولی" میں نے"

یہ پاٹ لک (ون ڈش پارٹی) ہر بدھ کو کسی ایک کے گھر ہوتی تھی، دوپہر کا وقت جب سب شوہر حضرات دفتروں میں اور بچے سکولوں میں تو یہ گھروں میں رہنے والی عورتیں "تبدیلی" کی خاطر یوں اکٹھی ہوتی تھیں۔ایک دوسرے کے ہاتھوں کے کھانے کھاتیں اور جو اٹھ کر جلدی چلی جاتی یا موجود نہ ہوتی اس کی کمیوں کجیوں پر پر مغز گفتگو کرتیں۔ پاکستان سے دور، رشتے داروں سے دور، سارا دن گھروں میں روٹین کے کام کرتے کرتے تھکن اتارنے کا ان کے پاس یہی ایک راستہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر یہاں بھی ایسی سیاست پکتی کہ بیک ہوم میں چھوڑی ہوئی ساسوں اور نندوں کی یاد تازہ ہو جاتی۔مگر پھر بھی یہ سلسلہ کئی مہینوں سے ایسے ہی کامیابی کے ساتھ چل رہا تھا کیونکہ جو عورت زیادہ گڑبڑ کرتی وہ خود بخود اس اجتماع سے خارج ہو جاتی تھی۔باقی آپس میں مفاہمت کا راستہ چُن لیتیں اور قیدِ تنہائی سے بچ جاتیں۔کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ یہ دنیا عقلمندوں کی ہے، دماغ کے بغیر تو کوئی kitty parties کا بھی زیادہ دیر تک ممبر نہیں رہ سکتا۔

رخسانہ چونکہ زبان کی اور دماغ کی تیز ہونے کی وجہ سے پروپیگنڈا پھیلانے کی بھی ماہر تھی، اس لئے ایسی پارٹیوں کا ناگزیر حصہ بلکہ بے تاج ملکہ ہی تھی، اسے ناپسند کرنے کے باوجود کوئی بھی اس سے دشمنی مول لینے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ مخالفین کو ایسے

کچلتی کہ کیا امریکہ سر اٹھانے والے غریب ملکوں کو کچلتا ہوگا۔اس لئے اس کی بھی نہ دشمنی اچھی نہ دوستی۔رخسانہ نام کی اس ہڈی کو عورتوں نے حلق میں پھنسا رکھا تھا، نہ اُگل سکتی تھیں اور نہ نگل اور یہ ہڈی بس چبھتی ہی رہتی تھی۔۔ابھی بھی موضوع بدلنے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی اور بات نند کو کوسنے دینے سے آگے نہ بڑھ سکی۔۔اور سب خواتین بے بسی سے اس پر بات کرتی رہیں۔

میزبان نے چائے کے پیالے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے تھوڑی سی ہمت کی اور بات کو نند کی شادی سے پھیلا کر بچوں کی شادیوں کے مسئلے تک لے گئی۔۔آج کل تو یہاں بچوں کی شادیوں کا بہت مسئلہ بن چکا ہے۔

"ہاں! اب تو ماشاءاللہ ایک نسل ادھر جوان ہوگئی ہے۔لیکن سمجھ نہیں آتی بچوں کے رشتے یہاں سے ڈھونڈیں جائیں یا پاکستان سے۔"۔ایک اور خاتون نے میزبان کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا جیسے بات چائے کی پیالی سے چھلک نہ جائے۔۔

"میں نے تو اپنے بیٹے سے کہہ دیا ہے کہ یہاں خود ہی اپنے مذہب اور ملک کی لڑکی ڈھونڈ لے، میں تو پاکستان سے بیوی لانے کے حق میں نہیں ہوں۔۔" ایک عورت نے اپنے فیشن ایبل بالوں کو جھٹکتے ہوئے قدرے لاپرواہی سے کہا۔۔

"ہیں۔۔یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ رخسانہ نے نند کی شادی سے زیادہ اس مسئلے کو سنگین پایا تو سب عورتوں کے ساتھ اسی موضوع پر طبع آزمائی کرنے لگ گئی:

"یہاں کی لڑکیوں سے اپنے لڑکوں کی شادیاں کریں؟.. یہ کہہ رہی ہیں آپ؟۔۔ رخسانہ نے ناک چڑھا کر انتہائی نخوت سے کہا تو کہنے والی بھی گھبرا گئی اور اپنے خیال کے دفاع میں کہنے لگی۔۔

"ہاں نا ایک تو سپانسر شپ کے جھمیلے، دوسرا یہاں کے پلے بڑھے لڑکوں کا مزاج

بالکل فرق ہوتا ہے، پاکستان کی لڑکیوں کو یہاں آ کر ایڈجسٹ کرنے میں ہی اتنا وقت لگ جاتا ہے۔۔"

"بالکل ٹھیک کہا زینب آپ نے اور پھر پیچھے گھر کو بھی یاد کرتی رہتی ہیں۔۔یہاں کی ہی فیملی ہو تو یہ مسئلے نہیں ہونگے۔"۔میزبان نے بھی پاکستان سے امپورٹ ہونے والی بیویوں کو رد کرتے ہوئے کہا۔۔

یہاں کی لڑکیاں؟ یہاں کی؟۔۔رخسانہ نے لڑکیوں کا لفظ ایسے دانتوں کے نیچے چبایا جیسے کینیڈا میں پلنے والی ساری لڑکیوں کو دانتوں کے نیچے رکھ کے چبا جائے گی۔۔

"بے لگام، آزاد، گھروں کو نہ بسانے والی۔۔ہوک۔۔(ہوکر کا لفظ منہ میں کچھ سوچ کر دم توڑ گیا)۔۔میں تو مر کر بھی اپنے بیٹے کی شادی یہاں نہ کرتی اسی لئے میں نے تو اپنی بہن کی بیٹی سے اپنے بیٹے کا نکاح کیا ہوا ہے۔پاکستان میں رہنے والی شریف لڑکی، سب سے بڑھ کر گھر کی دیکھی بھالی۔۔کینیڈا میں آ کر سب اپنی تہذیب بھول کر آزاد خیال ہونے کے چکر میں بچوں کو ایسی باتوں کی اجازت دے دیتے ہیں۔میں نے تو اتنا کنٹرول رکھا ہوا ہے کہ ہل نہیں سکتے۔۔"

اس بات پر کافی عورتوں نے ناگواری کا اظہار کیا مگر محفل کو بوجھل ہونے سے بچانے کے لئے ایک دفعہ پھر سے آنکھوں ہی آنکھوں میں درگزر اور اجتناب کا فیصلہ کیا گیا۔

پھر بھی ایک عورت سے رہا نہ گیا: " تو کیا آپ کے بیٹے نے کچھ نہیں کہا؟ یہاں کے بچے تو کزن میرج کے سخت خلاف ہیں"

اتنی جرات اُس کی.. میں نے اسے پیدا کیا ہے، اس نے نہیں۔بول کے تو دکھائے۔۔ بچے چیز ہی کیا ہوتے ہیں، ہمارے گندے پانی سے نکلی ہوئی بے بس مخلوق، جنہیں ہم اپنا

دودھ پلا کر بڑا کرتی ہیں۔۔۔اور بی بی کزن میرج کے اسلئے خلاف ہوتے ہیں کیونکہ انہیں ماں باپ نے اسلام کی صحیح تعلیم نہیں دی ہوتی۔"

ان تند و تیز کاٹ دار جملوں کے بعد بحث کی گنجائش سر چھپا کر بھاگ گئی۔۔ کچھ لمحوں کے لئے کمرے میں صرف چائے پینے کی آواز رہ گئی۔

پھر ایک دن ایسی ہی کسی پارٹی میں رخسانہ مٹھائی کے ڈبے کے ساتھ، سر پر معمول سے زیادہ کس کر سکارف باندھے، تقریباً خوشی سے ناچتی اور سب کو فخر سے یہ خبر سناتی پھر رہی تھی کہ

"اس کی بھانجی یعنی کہ اس کے بیٹے کی دلہن کو ویزہ مل گیا ہے اور وہ عنقریب کینیڈا آنے والی ہے اور پھر تم لوگ سب دیکھنا کہ کیسے پاکستان کی لڑکیاں گھروں کو بساتی ہیں۔۔ ارے یہاں کی لڑکیوں کے تو گھر بسانے والے لچھن ہی نہیں ہوتے۔۔اتنی آزاد اور منہ پھٹ ہوتی ہیں اور سب سے بڑی بات اس آزاد ماحول میں نجانے باہر کیا کیا کرتی پھرتی ہیں۔۔"

سٹریٹ کی سمجھدار عورتوں نے ایک دفعہ پھر سے بردباری اور تحمل کا مظاہرہ کیا اور خوشی کے موقعے پر کسی بھی بدمزگی سے بچنے کے لئے، رخسانہ کے اس طویل لیکچر کے بعد بھی کوئی بحث نہیں کی اور صرف مبارکباد دینے پر اکتفا کیا۔۔ایک دو عورتوں کے صبر کا پیمانہ ضرور لبریز ہوا خاص کر کہ جس نے پہلے کہا تھا کہ اس نے اپنے بیٹے کو کینیڈا میں ہی خود ہی لڑکی پسند کرنے کو کہہ رکھا ہے مگر رخسانہ جیسے شیر کے منہ میں کون ہاتھ ڈالتا لہٰذا خاموشی ہزار نعمت کا ورد دل میں پڑھ کر رخسانہ کی خوشی میں مصنوعی ہنسی ہنستی رہیں۔۔

آج منگل کا دن تھا۔ وہ تو ہر ہفتے آتا ہے مگر یہ منگل پی آئی اے کی وہ فلائٹ کینیڈا لا رہا تھا، جس میں رخسانہ کے بیٹے کی دلہن، اس کی اپنی بھانجی آرہی تھی۔ اس نے اور اس

کے بیٹے نے یہ دن انگلیوں پر گن گن کر کاٹے تھے اور آج انتظار دیدار میں بدل رہا تھا۔ رخسانہ کے بیٹے حسن نے تو کبھی اپنی منکوحہ سے کھل کر فون پر بھی بات نہیں کی تھی کیونکہ اس کی امی نے کہہ رکھا تھا کہ شادی سے پہلے بات کرنے یا زیادہ قریب رہنے سے بے برکتی ہوتی ہے، مانا نکاح ہو چکا ہے مگر رخصتی کے بغیر فون یا سکائپ پر قربت بھی گناہ ہے۔ اور حسن نمانے کی کیا جرات کے وہ ماں کی بات سے انکار کر سکتا، اس کے ذہن میں بچپن سے ہی یہ بات گھوٹ گھوٹ کر بٹھا دی گئی تھی کہ ماں ناراض تو خدا ناراض اور خدا ناراض تو سمجھو دنیا میں آپ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔۔۔رخسانہ کی بھانجی بھی اس کی تابعدار تھی اب تو آگے بھی خالہ ہی کی چلنے والی تھی، اس لئے رخسانہ کے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ اس نے اپنے گھر میں ہمیشہ کے لئے حکمرانی قائم رکھنے کی دوررس ترکیب لڑائی تھی، اور آج جب وہ ائیر پورٹ بھانجی کو لینے جا رہی تھی تو سوچ رہی تھی کہ:

"ناکام وہ لوگ ہوتے ہیں، جو بے وقوف ہوتے ہیں، اللہ کا شکر ہے میں نے ہمیشہ عقل سے فیصلے کئے اور میرے ہاتھوں سے کبھی کچھ نہیں نکلا۔۔" اس خاموش چہرے سے فتح کی مسکراہٹ ہونٹوں کے کناروں سے نکل نکل کر پورے چہرے پر پھیلنے لگی تو گاڑی میں ساتھ بیٹھے اس کے سدا کے مسکین شوہر نے پوچھا: کیا ہوا رخسانہ بیگم؟"

" کچھ نہیں میں سوچ رہی ہوں اب دیکھنا ان بحث کرنے والی عورتوں کو کیسا منہ توڑ جواب ملے گا، جب میری بھانجی میرے کنٹرول میں رہ کر ہمارا گھر سنبھالے گی تب انہیں پتہ چلے گا کہ یہاں کی خودسر، پھوہڑ اور آزاد خیال لڑکیوں سے شادی کرنے اور پاکستان کی شریف اور سگھڑ لڑکیوں سے شادی کرنے میں کیا فرق ہوتا ہے۔۔۔"

"ارے بیگم خدا کا خوف کرو ہماری بھی بیٹی یہیں کی پڑھی لکھی ہے۔۔"

شوہر کے منہ سے نجانے کیسے خوفناک بیوی کے خیال کے مخالف جملے نکل گئے،

شائداس کی آنکھوں میں اپنی معصوم اورشریف بیٹی کا چہرہ گھوم گیا تھا۔ جوکینیڈا میں ہی پیدا ہوئی تھی مگر ماں کی چالاکیوں اورسختیوں کی وجہ سے گھبرائی اورڈری ڈری رہتی تھی۔اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کینیڈا میں رہنے والی لڑکی ہے۔اوراس بات کا سوفی صدکریڈٹ رخسانہ اپنے آپ کو دیتی تھی۔اس کی بیٹی جب خوفزدہ نظروں سے ماں کو دیکھتی تھی تو رخسانہ کا کلیجہ کانپتا نہیں تھا بلکہ وہ مطمئن ہوجاتی تھی کہ اس کی تربیت میں کوئی کسر نہیں رہ گئی اورکینیڈا میں رہتے ہوئے بھی اس نے اپنے بیٹے اور بیٹی کو بڑوں کا ادب لحاظ اورشرافت سکھائی ہے۔

"لعنت تمھاری سوچ پر، رخسانہ تو جیسے پھٹ ہی پڑی۔۔شرم کرو اپنی معصوم بچی کو کن چنڈال لڑکیوں سے ملارہے ہو۔۔یہاں کی لڑکیوں سے؟ رخسانہ کا لمبا ناک" یہاں کی لڑکیاں" کہتے ہوئے حسبِ عادت نخوت سے دوسینٹی میٹراوپر چڑھ گیا، میاں! میں نے پالا ہے اسے۔۔رخسانہ نے اپنے سینے پرزورزور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔۔میں نے، تمھاری بھگوڑی بہن نے نہیں۔۔ارے شرم۔۔

ا" چھا اچھا تم ٹھیک کہہ رہی ہو" ڈرائیو کرتے ہوئے بیٹے کے سامنے اپنی، اپنی بہن اوراپنے پرانے خاندان کے صدیوں پرانے اورنئے گناہ سننے کی آج کے دن اس میں تاب نہیں تھی،"اب تو بہو بھی آنے والی ہے۔۔اس عورت کی زبان سے اورہاتھوں سے نئی آنے والی بچی کے سامنے اپنی عزت کیسے محفوظ رکھ پاؤں گا۔۔"اس سوچ سے ہی اس کے پورے جسم میں کپکپی طاری ہوگئی۔

بیٹے نے بھی باپ کی درگت بنتے دیکھ کر یہی سوچا۔۔" کیسے اپنی بیوی کے سامنے اپنی اورباپ کی عزت بچا پاؤں گا۔۔"

رخسانہ نے خوشی کی اس گھڑی میں بات کوطول دینے کی بجائے میاں کووقتی طور پر

معاف کر دیا۔۔اور پھر سے دھیرے دھیرے مسکرانے لگی۔ائیر پورٹ پہنچ کر رخسانہ مسافروں کوریسیو کرنے والوں کے ہجوم میں تیزی سے راستہ بناتی ہوئی سب سے آگے جنگلے پرتقریباً لٹک سی گئی۔بیٹی، بیٹا اورشوہر پیچھے ہی کھڑے رہ گئے، ان میں رخسانہ جیسا ٹیلنٹ نہیں تھا، انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی ہیں، مگر رخسانہ وہاں بھی ادھرادھر کھڑے لوگوں کو مفت مشورے، نصیحتیں، اپنی کامیابی کے راز بتانے لگی، کبھی کبھی پیچھے مڑ کروہ اپنی فیملی کوبھی دیکھ لیتی، بیٹے کو تھمبز اپ دکھاتی، اور بیٹی سے نظریں چار ہوتیں تو اسے سکارف اور کسنے کا اشارہ کرتی۔وہ چاہتی تھی کہ اسکی بھانجی کو آتے ہی پتہ چل جائے کہ میری بیٹی کیسے سکارف باندھتی ہے تاکہ وہ پرپرزے نکالنے کا سوچے بھی نہ۔۔اس کے علاوہ بھی وہ بھانجی کوقابو میں رکھنے کے طریقوں پرغور کرتی جارہی تھی۔فکر کے وقفے میں وہ لوگوں سے باتوں میں مشغول ہوجاتی اورلاپرواہی سے سوچتی" بھانجی ہی تو ہے"۔۔

اورآخر کار انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اورفلائٹ آگئی پھرائیرپورٹ کے اندرونی دروازے سے مسافر نکلنے شروع ہوگئے۔رخسانہ کا دل خوشی کے مارے بے قابو ہورہا تھا۔

ہائے اتنے سالوں بعد دیکھوں گی، پہچان تو لوں گی؟ کیوں نہیں۔۔خون ہے میرا۔۔نہ جانے اسے کیوں کھڑے کھڑے وہم ہونے لگا کہ وہ اسے پہچان نہیں پائے گی، اسی کشمکش میں مدد لینے کے خیال سے مڑ کرحسن کو دیکھا مگر اس نے تو اپنے بیٹے کو اپنی منکوحہ سے بات تک کرنے کی اجازت نہیں دی تھی یہ کہہ کر کہ شادی سے پہلے ایسی حرکتوں سے نحوست ہوتی ہے، اس لئے اب بھی وہ ماں پرسب چھوڑے لاپرواہی سے اپنی بہن اور باپ سے باتوں میں مصروف تھا۔

" بھانجی ہے خود ہی بھاگ کر لپٹ جائے گی۔۔"اس نے مسکرا کر سوچا اورسکون سے ریلنگ کے اوپر مزید جھک گئی۔۔حسن ماں کے ڈر سے نہ خوشی کا اظہار کر رہا تھا نہ

بے صبری کا۔۔بس دل میں سب جذبات دبائے نارمل نظر آنے کی کوشش میں ائیر پورٹ کے جناتی دروازے کو کھلتے ،مسافروں کے باہر نکلتے ،اور بند ہوتے دیکھنے سے اجتناب کر رہا تھا۔مگر ایکدم باپ اور بہن سے باتیں کرتے اسے محسوس ہوا کہ بہت دیر ہوگئی ہے اور تقریباً تمام مسافر نکل چکے ہیں۔اب اندرونی دروازہ بہت دیر سے کھلا بھی نہیں۔۔اس نے برسوں کی عادت کے مطابق اپنی ماں کی طرف دیکھا۔وہ ریلنگ پر سر رکھے رکھے شائد سوگئی تھی۔۔مسافروں کو لینے کے لئے آنے والے تقریبا سب لوگ جا چکے تھے۔۔

یہ کیا؟ ابو دیکھیں سب مسافر تو لگتا نکل آئے ہیں،تو کیا ماریہ اسی فلائٹ سے نہیں آرہی تھی؟حسن کے چہرے پر اب تشویش کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔

"ارے ہاں ، یہ کیا گڑ بڑ ہے۔۔ابو نے بھی ایک دم چونک کے دیکھا۔۔"نیک بخت،انہوں نے وہیں سے رخسانہ کو پکارا۔۔

وہ ایکدم چونک کے سیدھی ہوئی۔۔

"ارے یہ کیا سارا ائیر پورٹ خالی کیوں ہوگیا؟ ماریہ کیوں نہیں نکلی؟"

"پہلی دفعہ آرہی ہے شائد اندر امیگریشن میں دیر ہو رہی ہے ، کوئی مسئلہ نہ ہو امی،حسن نے وسوسہ بھری نظروں سے ماں کو دیکھ کے کہا۔۔

"مسئلہ کیا؟ وکیل کو اتنی فیس دے کر یہ کیس کروایا ہے،مسئلہ کیا۔۔؟ وہ جیسے بیٹے کو نہیں خود کو تسلی دے رہی تھی۔۔

"فلائٹ تو آج ہی کی تھی نا؟"رخسانہ نے حسن کا اندیشہ دہرایا۔۔

"ہاں ہاں حسن کی ماں آج ہی کی تھی ، میرے فون پر ابھی بھی فلائٹ کا نمبر، دن اور وقت سب موجود ہے جو تمھارے بہنوئی نے بھیجا تھا،

لو دیکھو ابھی نکال کے تمھیں دکھاتا ہوں۔۔"

"جلدی دکھاؤ، میرا تو دل اڑا جا رہا ہے۔۔کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو میری بچی کو، اندر نہ بٹھا چھوڑا ہو،معصوم سی جان،کبھی باہر کی ہوا نہیں لگی اسے،گھر کے اندر بند رہنے والی بچی،اکیلی آ رہی تھی۔۔جلدی دیکھو یہی فلائٹ ہے؟"

"یہ نہیں ہے؟ تمھارا رنگ کیوں زرد ہو گیا ہے؟ مجھے پتہ تھا یہ نہیں ہو گی فلائٹ ، اگلے منگل کی ہو گی،تم انتہائی نکمے انسان ہو،تم سے کچھ ٹھیک سے نہیں پڑھا جاتا, فضول میں اتنا پٹرول لگ گیا، پارکنگ کے اتنے پیسے بن گئے ہوں گے، وقت الگ برباد،حسن کو فضول چھٹی کروائی۔۔کم بخت دھیان سے نہیں پڑھ سکتے کچھ،اب منہ سے قبولو، گم سم کیا کھڑے ہو۔۔غلط تاریخ پڑھی ہے نا؟

"نہیں یہی تاریخ ہے ، یہی وقت ، ہے اور یہی فلائٹ ہے ۔۔۔۔۔مگر مگر ۔۔۔۔۔۔"

" کیا مگر مگر؟ کیا مگر مگر۔۔۔۔۔"

"حسن یہ پیغام ہے ماریہ نے، تمھاری بیوی نے اور پھر اپنی خونخوار آنکھوں سے گھورتی بیوی کو دیکھتے ہوئے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا اور تمھاری بھانجی نے میرے سیل فون پر ہی بھیج دیا ہے لو پڑھ لو۔۔"

"پیغام؟۔۔کیا؟ پڑھو جلدی حسن جلدی پڑھو۔۔میرا دم نکلا جا رہا ہے، اپنی بہن کو کیا جواب دوں گی؟ اس کی معصوم بیٹی۔۔

"امی۔۔چپ کریں۔۔چپ کر کے سنیں"، پہلی دفعہ اس نے حسن کی آنکھوں میں شدید غصہ دیکھا تو سہم گئی۔۔۔

" آپ کی معصوم بھانجی لکھتی ہے، میرا ائیر پورٹ پر انتظار کر کے اپنا وقت برباد نہ کریں، میں خیریت سے کینیڈا پہنچ گئی ہوں اور جہاں جانا تھا ادھر کو روانہ بھی ہو چکی ہوں ،

میں خالہ کا یا کسی بھی فیملی کے بندے کا سامنا نہیں کرنا چاہتی ۔مگر مجھے یہ پتہ ہے کہ میں نے اپنی خوشی اور اپنی محبت کی خاطر جو کیا ہے وہ ٹھیک ہے ۔ میں اپنے کئے پر شرمندہ نہیں ہوں ۔میں نے حسن کے ساتھ نکاح کا سہارا خود نہیں لیا، بلکہ آپ لوگوں نے مل کر مجھے مجبور کیا کہ میں ایک ایسے انسان کے ساتھ شادی کروں جس سے میں نے کبھی ٹھیک سے بات بھی نہیں کی ، دیکھنا تو دور کی بات ۔ میں یہ نکاح ہی نہ کرتی مگر مجھے جس سے محبت ہے وہ امریکہ میں غیر قانونی طریقے سے رہ رہا تھا، جب میں نے اسے اپنے نکاح کے بارے میں بتایا تو اس نے ہی مجھے یہ آئیڈیا دیا کہ اپنے کزن سے نکاح کر کے کینیڈا آ جاؤ، اور جب میں یہاں کی شہری بن جاؤں تو اسے کینیڈا ہی سپانسر کرلوں ۔ سب اپنے لئے اچھا سوچتے ہیں اور محبت کرنے والے تو کچھ زیادہ ہی اپنے بارے میں سوچتے ہیں ۔ میں خود غرض نہیں ، نہ دھوکے باز ہوں کیونکہ میں نے ایک انڈین فلم میں سنا تھا کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے ۔سو خالہ خالو اور میرے نام نہاد شوہر، آپ لوگ میرا انتظار نہ کریں اور میں اپنے "ان کے" دوست کے ہاں ہی ٹھہروں گی جب تک میری طلاق اور دوبارہ شادی نہیں ہو جاتی ۔ میرے لئے یہ وقت مشکل ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ کینیڈا میں عورتوں کے پاس بڑے حقوق ہیں ۔۔آپ کے تعاون کا شکریہ ۔"

رخسانہ تو وہیں غش کھا کے گر پڑی اور حسن کے بدن سے جیسے کسی نے سارا خون ہی نچوڑ لیا ہو۔۔اس دن وہ کیسے گھر پہنچے بس وہی جانتے تھے۔

ماں کی تابعداری کے نتائج اتنے برے ہونگے کہ وہ دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا ۔۔ بے عزتی اور اس طرح استعمال ہونے پر اس کے اندر ایک لاوا سا پکنے لگا تھا اور اب وہ ماں کو بات بات پر کاٹ کھانے کو دوڑنے لگ گیا تھا ۔ گو کہ ماں نے اپنی ڈھیٹ فطرت کی وجہ سے شکست تسلیم نہیں کی تھی مگر وہ پرانے والا رعب بچانے میں بھی

اتنی کامیاب نہیں رہ گئی تھی ۔

رخسانہ نے جب پاکستان میں بہن سے بات کی تو وہ اتنا نقلی حیران اور پریشان ہوئی کہ اوورا ایکٹنگ کے نمبر بھی اسے نہ مل سکیں ۔ رخسانہ جس سے لوگ اس لئے ڈرتے تھے کہ وہ بدنام کرنے کی ماہر تھی ۔ اب بہن اور اس کی بیٹی کو بدنام بھی کرنا چاہتی تو نہ کر سکتی تھی کیونکہ اس میں اس کی اپنی لمبی ناک زیادہ کٹتی تھی ۔

رخسانہ نے خواتین کے لنچ گروپ میں جانا تو چھوڑ دیا، مگر وہاں تک بات پہنچنے سے نہ روک سکی ۔ کسی کی غیر موجودگی میں ٹھٹھے لگانے کا ایسا نایاب اور حسین موقعہ ان عورتوں کو بھی زندگی میں پہلی بار ہی نصیب ہوا تھا، اور وہ بھی رخسانہ کے لئے ۔ اس خبر کے بعد اس ہفتے عورتوں نے بدھ کے علاوہ جمعے کو بھی پارٹی رکھی کیونکہ ایکدن میں یہ قصہ ختم ہونے والا نہیں تھا اور کھانے میں مرچ مصالحہ کم ڈالا گیا کیونکہ اس "واقعہ" میں چٹخارے اور مصالحے بہت تھے ۔۔میزبان نے کہا" کھانے اور واقعے دونوں میں مصالحے تیز ہو گئے تو معدوں کا کیا بنے گا"۔۔۔ کمرہ دیر تک قہقہوں سے گونجتا رہا۔

بیٹے کے قصے سے رخسانہ ابھی پوری طرح سنبھلی نہیں تھی کہ اُسے اب اپنی بیٹی کی فکر لاحق ہونے لگی ۔۔ کچھ تو ایسا ہو جس سے غم دور ہوں اور اس کا دبدبہ بھی واپس لوٹے ، اس کے گھر میں بہو کے آنے کے بعد نہیں بلکہ بہو کے ایئر پورٹ سے بھاگ جانے کے بعد، کنٹرول ختم ہو رہا تھا ۔ اس سے پہلے کہ گھر کی بادشاہت مکمل طور پر ہاتھ سے نکل جائے ، گھر میں اپنی عقلمندی کی چھاپ پھر سے لگانی ضروری تھی ۔ ورنہ ایک طرف بیٹا گھورتا رہتا تھا اور دوسری طرف بے زبان شوہر کو ایسی زبان لگ گئی تھی کہ اب وہ اٹھتے بیٹھتے اسے ناسمجھی کے طعنے دینے لگ گیا تھا ۔

" کسی اچھی جگہ بیٹی کی شادی، عزت بچانے کا اور کھویا ہوا وقار واپس لانے کا بس

یہی حل نظر آ رہا تھا۔۔"

مگر بیٹی کا رشتہ ڈھونڈنا بہت ہی مشکل کام ثابت ہو رہا تھا۔ بیٹے کے ساتھ ہوئے حادثے نے اسے پاکستان سے دولہا امپورٹ کرنے سے توتوبہ کروادی۔ اس لئے اب لڑکی کا برکینیڈا میں ہی ڈھونڈنا تھا۔ کچھ دن گوشہ نشین ہونے کے بعد اس نے دوبارہ سے اسی حلقے میں آنا جانا شروع کر دیا۔ ہجوم میں نہیں بلکہ ایک ایک سے علیحدگی میں، تعلقات کی تجدید کی، جارحانہ رویئے کو پسِ پشت ڈال دیا کیونکہ بچپن میں اس کی ماں نے اسے یہی سکھایا تھا کہ گدھوں کو لاٹھی سے ہانکو، مگر ضرورت پڑنے پر انہی گدھوں کو فوراً باپ بنالو۔۔

اس لئے اس نے زینب کو فون کیا اور پوچھا:

" کیا شمیم اپنے بیٹے کے لئے لڑکی ڈھونڈ رہی ہے؟ یہ سوال زینب سے کرتے ہوئے اسے وہ دن یاد آ رہے تھے جب وہ اس گدھی کا مذاق اڑایا کرتی تھی کہ" مفت میں لوگوں کے کام کرواتی پھرتی ہو، اس کا کیا فائدہ ہوتا ہے (ان کاموں میں ایک دوسرے کو بچوں کے رشتے بتانا بھی شامل تھا)"

اور زینب عاجزی سے کہتی تھی کہ " فائدے کا تو کبھی نہیں سوچا بس کسی کا اچھا ہو جائے اور وہ دعا دے دے۔۔بس۔۔اور جب ہم اچھا کرتے جاتے ہیں تو اچھائی خود ہی ایک دن دروازے پر دستک دے کر واپس آپ کے پاس آجاتی ہی" , رخسانہ اسے انتہائی غیر عملی عورت سمجھ کر ہمیشہ ناگواری سے ہی بلاتی تھی اور زینب اب بھی اسکے پرانے تیکھے رویئے اور کڑوی باتوں کو بھول کر اسکی بات کا سکون سے جواب دے رہی تھی:

"ہاں وہ دیکھ تو رہی ہے۔۔" زینب کی تصدیق نے جیسے رخسانہ کے اندر نئی امنگ جگادی ہو۔

"میری بہن! تمھارا مجھ پر ساری عمر یہ احسان رہے گا اگر تم صرف اتنا کرو کہ شمیم کے کانوں میں ڈال دو کہ میں بھی بیٹی کا رشتہ دیکھ رہی ہوں۔۔میری بیٹی اتنی پیاری، شریف

اور تابعدار ہے کہ وہ خود بخود آگے بات چلائے گی۔۔پھر آگے یا قسمت یا نصیب۔۔۔میرا یہ کام کر دو گی نا۔۔؟ میں نے تمھیں ہمیشہ اپنی چھوٹی بہن سمجھا اور خدا تمھارے خلوص کا تمھیں صلہ دے گا۔ تمھارے جیسے لوگ دنیا میں اب کہاں؟"

ہاں ہاں کہہ دوں گی مگر یہ تو بتاؤ کہ شمیم کو تو سعودی عرب سے کینیڈا آئے ابھی ایک دو سال ہی ہوئے ہیں، ابھی اس کا زیادہ لوگوں سے ملنا جلنا بھی نہیں، تم اسے کیسے جانتی ہو؟ زینب نے اُس سے پوچھا۔

"میں تو اسے ایک ہی بار ملی ہوں، نگہت کی بیٹی کی شادی پر، اپنے شوہر اور ماشااللہ سے تین جوان جہان بیٹوں کے ساتھ، دیکھنے میں سادی سی عورت لگی تھی مجھے۔ مگر بیٹے اس کے تب ہی میں نے تاڑ لئے تھے۔ ابھی ابھی سعودی عرب سے آئے ہیں تو یہاں کے لڑکوں کی طرح بگڑے ہوئے نہیں لگتے بڑی اچھی تربیت لگتی۔۔ ہے نا؟" رخسانہ نے سوالیہ نظروں سے زینب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔۔

"ہاں ہیں تو بہت ہی سعادت منداور شریف لڑکے۔۔میں پوچھ دوں گی اسے تم فکر نہ کرو۔۔"

"ہاں تمھیں تو پتہ ہے پہلے ہی میں کتنے بڑے دکھ سے گذری ہوں۔۔" رخسانہ نے زینب کی نرم دلی کو جانتے ہوئے اپنا ہمدردی کا تیر پھینکا۔۔ تیر نشانے پر لگا، کیسے نہ لگتا، رخسانہ نے اپنی مظلومیت اور زینب کی تعریفوں کا ایسا جال بچھایا تھا کہ اس معصوم عورت کا بچنا ناممکن تھا لہٰذا وہ تندہی سے اپنے مشن پر لگ گئی۔۔

اور پھر اگلے ہی دن زینب رخسانہ کو فون پر بتا رہی تھی کہ:

"میں نے شمیم سے بات کی تھی۔۔زینب نے ابھی اتنا ہی کہا کہ رخسانہ فرطِ جذبات سے لبریز ہوگئی۔۔

" کون کہتا ہے خون کے رشتے ہی بس کام آتے، تم نے تو بہنوں سے بھی بڑھ کر کیا۔

کل ہی میں نے تمھیں کہا اور آج تم نے بات بھی کر لی ۔۔ ورنہ کون کسی کا کام یاد رکھتا ۔۔ اللہ تمھیں بہت خوشیاں دے ۔۔۔۔۔"

"اللہ تمھیں بھی خوشیاں دے ۔۔ میں نے شمیم سے تفصیلی بات کی ، تمھارا بتایا ، تمھاری بیٹی کا ، گھر کا ۔۔۔"

"ہاں وہ تو فوراً سے ہی مان گئی ہو گی ، ارے بھئی اُسے میری بیٹی جیسی خوبصورت اور شریف لڑکی کینیڈا میں کہاں ملے گی ۔۔۔"

"ہاں اللہ اس کے نصیب اچھے کرے بڑی سعادت منداور پیاری بچی ہے ۔۔۔"

"میری ہی تربیت ہے بہن ,ورنہ یہاں کا حال تو پتہ ہی ہے ۔۔ رخسانہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زینب کو فون سے نکال کر گلے لگا لے ۔۔۔

"تمھاری تربیت اور سمجھداری سے کسے انکار ہے ؟ مگر بات یہ ہے کہ شمیم اور اس کے بیٹوں کا خیال ہے کہ کینیڈا میں کوئی لڑکی شریف نہیں ہوتی ۔ بہت آزاد خیال اور من موجی ہوتی ہیں ۔ نہ گھر سنبھال سکتی ہیں اور نہ شوہر کو ۔۔ بوائے فرینڈز رکھتی ہیں اور بس ۔۔۔۔"

"غضب خدا کا کسی کی بیٹیوں کے بارے میں ایسے منہ بھر کے تھوڑی کوئی کہتا ہے ۔۔ زینب تم نے انھیں بتایا نہیں کہ میری بیٹی حجاب لیتی ہے ، نمازیں پڑھتی ہے ، اونچی آواز میں بات نہیں کرتی ، قہقہہ لگا کے ہنستی نہیں ہے ، یہاں کی ٹین ایج لڑکیوں کی طرح اوٹ پٹانگ فیشن نہیں کرتی ۔ بتایا نہیں تم نے ؟ کسی کی بیٹیوں کے بارے میں ایسے منہ پھاڑ کے تھوڑی کہتے ہیں ۔۔ توبہ توبہ لوگوں کے دلوں میں خوفِ خدا بھی نہیں ۔ اپنی بیٹیاں نہیں تو کیا دوسروں کی بیٹیوں کی عزت کا بھی پاس نہیں ۔۔ بیٹیاں تو سانجھی ہوتی ہیں ۔ ہے کہ نہیں ؟

"جی بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں ۔۔ زینب نے اب کے الفاظ دانتوں کے نیچے اچھی طرح چبائے ۔۔۔

پھر خود کلامی والے انداز میں بولی اور میں نے شمیم کو بتایا کہ " بچی بہت معصوم اور

شریف ہے ، کینیڈا کی تو اسے ہوا بھی نہیں لگی اور سارا گھر سنبھال لیتی ہے ، ایک دفعہ دیکھ تو لیں اس بات پر رخسانہ شمیم تو چپ کر گئی تھی جیسے مان ہی گئی ہو مگر اس کے لڑکے نے کہا آنٹی ایسی لڑکیاں ماں باپ کے سامنے کچھ اور پیٹھ پیچھے کچھ ہوتی ہیں ، گھروں سے حجاب پہن کے آتی ہیں اور باہر آ کر مغربی کپڑے پہن لیتی ہیں اور یہ آزاد نظر آنے والی لڑکیوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہیں ، بڑی دوغلی ہو جاتی ہیں ۔

اور پھر پتہ ہے شمیم جو تھوڑا تھوڑا مان گئی تھی بیٹے کی بات سن کر کہنے لگی کہ "ہاں بھئی ، ایسی لڑکیاں جن کو ماؤں نے سختی سے پالا ہوتا ہے انہیں ڈبل رول کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے ، بہت گھنی ہو جاتی ہیں اور دنیا کو نچا چھوڑتی ہیں ۔۔۔ ہم تو کینیڈا سے نہیں بس پاکستان سے ہی لڑکیاں لائیں گے ۔۔"

"تم نے انہیں کہا میں نے اپنی بیٹی کو سختی سے پالا ہے ؟ رخسانہ نے زینب کی بات اچکتے ہوئے غصے سے کہا ۔۔

"ایسے نہیں کہا ۔۔ ایسے کہا کہ بچی کی تربیت ماں نے بہت اچھی کی ہے ۔۔۔"

اور سختی سے کی یہ انہیں خواب آ گیا ؟ رخسانہ کی سوئی ادھر ہی اٹک گئی

"نہیں ظاہر ہے میں نے ہی کچھ ۔۔ لیکن ایسے نہیں ۔۔۔"

"ایسے نہیں تو کیسے ۔۔ تم لوگ حاسد ہو ، اس کے لڑکوں پر تمھاری اپنی کسی بھانجی بھتیجی کے لئے نظر ہو گی ۔۔ خدا نے تمھیں خود تو اولاد دی نہیں مگر تم میری بیٹی کا گھر بھی کیوں بساؤ گی ، پاکستان سے کوئی اپنی غریب رشتے دار لاؤ گی ۔۔ آئندہ مجھے فون نہ کرنا ایسی دوستیوں سے میں باز آئی " یہ کہتے ہی رخسانہ نے فون غصے سے فرش پر پٹک دیا ۔۔

اور دوسری طرف خلوص سے بھری مگر اولاد سے خالی جھولی والی زینب تھوڑی دیر پہلے اپنی ہونے والی تعریف اور اب کی تذلیل کو لے کر گھبرائی گھبرائی سی سوچ رہی تھی کہ بھلا رخسانہ کی کون سی بات سچ ہو گی ؟

ناشکری

چیاؤں چیاؤں چیاؤں۔۔۔۔۔۔

"ہائے اللہ! لگتا ہے پھر کسی نے بلو رانی کو پتھر مارا ہے"۔۔راحت نے درد میں ڈوبی بلو رانی کی چیخ سنی تو اس کا اپنا دل درد سے پھٹنے لگا۔

راحت کو آج بھی بلو رانی سے اپنی پہلی ملاقات یاد تھی۔ جب وہ سجی سجائی کار سے دلہن بنی اپنے نئے نویلے دلہا اور نند کے سہارے نیچے اتری تھی تو اسے سب سے پہلا سلام بلو رانی نے ہی اُس کا سرخ لہنگا تھام کر پیش کیا تھا اور اس نے جب ایک کتے کو اپنا لہنگا چاٹتے دیکھا تو ڈر اور نفرت سے اس کی ایسی چیخ نکلی کہ سب حیرت سے دلہن کو تکنے لگ گئے تھے اور اگر وہ چار ہاتھوں کے سہارے میں نہ ہوتی تو یقینا گر ہی جاتی، پھر جیسے ہی صورتحال سمجھ آئی سب باراتیوں نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

"لو جی بلو رانی نے تو نئی نویلی دلہن کو شرم وحیا ہی بھلا دی"۔۔ایک بوڑھی اماں نے پان کی لال پچکاری سے دیوار رنگین کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"یہ ہے بلو رانی، جو اس محلے کی جان بھی ہے اور محافظ بھی۔۔اس سے کبھی نہ ڈرنا۔۔" اس کے شوہر نے اس کے کان میں چپکے سے کہا تھا اور وہ خاموشی سے دل کی دھڑکنوں کو ترتیب میں لانے کی کوشش میں لگ گئی تھی۔۔آتے ہی ایسی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا اسی لئے اس نے کمرے میں پیار بھری سرگوشیوں کے درمیان رُک کر اپنے

خاوند کو بتایا تھا کہ اسے کتوں سے بہت ڈر لگتا ہے بلکہ انہیں دیکھ کر اسے کراہیت محسوس ہوتی ہے۔۔

"میری جان یہ کتا نہیں ہے بلکہ یہ تو کتیا ہے، مونث۔۔یعنی کہ تیری برادری کی۔۔۔۔"

میری برادری کی؟ اُس نے اس مماثلت پر تُنک کر کہا تھا۔۔

"کہنے کا مطلب یہ ہے میری جان کہ کتوں سے بے شک ڈرتی رہو، مگر یہ تو عورت ذات ہے، بےضرر سی، جو اس محلے کے سب لوگوں کو پیار بھی دیتی ہے اور ان کی حفاظت بھی کرتی ہے، یہ پیار کے قابل مخلوق ہے، اس سے کیسا ڈرنا؟۔۔۔اچھا چھوڑو یہ نفرت کی خبر پھر کبھی دینا آج تو محبت دینے کی رات ہے"۔۔۔اور وہ کھسیانی سی ہو گئی تھی۔۔

"میں بھی کتنی بے وقوف ہوں، پہلی ہی رات کیا باتیں چھیڑ دیں۔"

مگر یہ حقیقت تھی کہ اسے کتوں سے بڑی نفرت تھی، انہیں زبان ہلاتے دیکھ کر، اس کو بڑی کراہیت کا احساس ہوتا تھا۔۔۔ہاں مگر یہ تو کتیا ہے۔۔مونث برادری کی۔۔۔ توبہ!! بعد میں اسے پتہ چلا تھا کہ ثاقب کے منہ میں جو آتا ہے کہہ دیتا ہے مگر تب پیار کی اس رات اسے یہ مماثلت بھی بری نہیں لگی تھی۔۔۔

گزرتے دنوں کے ساتھ اسے پتہ چلا کہ وہ پیاری سی کتیا واقعی ہی میں پورے محلے کی جان تھی۔ نہ جانے کہاں سے آئی تھی مگر سب محلے والے اُسے ایسے پیار کرتے تھے جیسے ہر ایک کے گھر میں پیدا ہوئی ہو اور بس وہیں کی باسی ہو۔ وہ تھی ہی بڑی پیاری سفید رنگ اور اوپر کالے کالے چھلے دائرے۔ اور صفائی کا تو اتنا خیال رکھتی کہ محلے کی مسجد کے مولوی صاحب بھی اسے ہاتھ لگا کر پیار کرتے تھا۔ مسجد کے باہر جا کر بیٹھ جاتی تو آتے جاتے نمازی بھی اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر گزرتے تھے، یعنی وہ، اس محلے میں کسی انوکھی

لاڈلی کی طرح رہتی تھی۔اس کی حرکتیں دیکھ کر راحت کو نہ صرف اس سے خوف یا کراہیت آنا بند ہوگئی بلکہ وہ اسے بہت پیاری لگنے لگ گئی اسی لئے جب وہ ٹہلتے ہوئے ان کے صحن میں آنکلتی تو راحت بھی باقی گھروں کی طرح اس کی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتی تھی ۔بلاشبہ بلورانی کو دل جیت کا فن آتا تھا۔

بلورانی کا محلے والوں کو فائدہ بھی تھا۔آندھی یا زلزلے کی خبر محکمۂ موسمیات سے بھی پہلے وہ دیتی تھی اور اس کے ہوتے ہوئے محلے والوں کو باقی محلوں کی طرح چوکیدار نہیں رکھنا پڑتا تھا، اور ایسی وفادار تھی کہ کسی اجنبی کی کیا مجال جو اس محلے سے اس کی نظروں میں آئے بغیر گذر جائے اور کیا مجال کوئی فقیر یا چور اس محلے میں پھٹک بھی جائے۔

راحت کو وہ دن آج بھی یاد تھا جب بلورانی نے وکیل صاحب کے ہاں چوری ہونے سے بچائی تھی۔ پورے محلے میں بلکہ دور دور کے سب محلوں میں اس کی وفاداری اور بہادری کی دھوم مچ گئی تھی۔ جب وہ چور کی ٹانگ کو چمٹ گئی تھی اور چور نے اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے اس کے سر پر لاٹھی بھی ماری تھی، مگر وہ تھی کہ چمٹی ہی رہی تھی جب تک کہ سارا محلہ اکٹھا نہیں ہو گیا اور چور کو پولیس کے حوالے نہیں کر دیا گیا تھا۔ ۔۔صبح وکیل صاحب نے بلورانی کے گلے میں ایک خوبصورت چمکتا ہوا پٹہ انعام کے طور پر ڈالا تھا جس کے اوپر "بلورانی" لال رنگ سے کھدا ہوا تھا۔اسے پہن کر بلورانی کی چال میں غرور سا آ گیا تھا۔وہ پہلے بھی گلی کے آوارہ کتوں سے کنی کترائے رکھتی تھی اب تو بالکل ہی اپنے آپ کو ان سب سے الگ سمجھنے لگ گئی تھی، اس کی حرکتیں دیکھ کے صاف پتہ چلتا کہ بلورانی کو اپنی انفرادیت کا خوب احساس ہے۔

"تم تو اور لڑکیوں سے بہت مختلف ہو۔۔نہ نئے کپڑوں کی فرمائشیں نہ زیور، نہ محلے میں گھوم گھوم کر چغلیاں کرنے کی عادت۔۔راحت جان تم تو بڑے مزے کی چیز

ہو"۔۔شروع شروع میں جب ثاقب کو اس پر لاڈ آتا تھا تو یہی کلمات دہرا دیتا تھا۔

ہر وقت ہنسنے، مسکرانے والی، اپنے خلوص اور پیار کے ساتھ ہر ایک کے بھاگ بھاگ کر کام آنے والی راحت،" چیز" کہنے پر بڑے ناز سے تلملا اٹھتی تھی۔۔"منفرد ہوں اس لئے" چیز" نہیں ہوں پورا ایک فرد ہوں۔۔مجھے فرد تسلیم کیا جائے۔۔"

وہ جب بیاہ کر اس گھر اور محلے میں آئی تھی تبھی اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ ان سب سے الگ ہے اور اس کی انفرادیت اس کے خلوص اور پیار میں تھی۔۔اس کی سہیلی نازو بھی یہی کہا کرتی تھی کہ تو تو بے وقوفی کی حد تک مخلص ہے، کبھی اپنا بھی سوچ لیا کر پاگل۔۔ سسرال والے نگل جائیں گے تجھے۔۔"

"لے!! پیار بھی کوئی نگلنے کی چیز ہے۔۔ پاگل تو تُو ہے"۔۔وہ نازو کو پیار سے کہتی تھی۔

مگر جیسے جیسے دن گزر رہے تھے نازو کی بات سچ ثابت ہو رہی تھی، اس کا خلوص سسرالی رویوں نے نگل ہی لیا تھا اور ڈکار بھی نہیں مارا تھا۔اسے واقعی "چیز" ہی سمجھا گیا تھا پہلے جس بات کو وہ مذاق سمجھتی تھی ناقدری نے اسے احساس دلایا کہ پورے فسانے میں بات تو صرف وہی سچ تھی، اس آگاہی نے اسکے اندر ایک ضد سی پیدا کر دی۔۔اپنی ذات کو منوانے کی ضد۔اسے سمجھ نہ آتی تھی کہ کسی کے پاس بھی اسکے خلوص کی پہچان کیوں نہیں ہے، کیوں اسے بس ایسے ہی لے لیا گیا ہے جیسے وہ کچھ بھی نہیں، جیسے وہ کچھ بھی نہیں کرتی، جیسے اس کی محبت کی کوئی اوقات نہیں، جیسے وہ بس بے اوقاتی سی ہے۔کام کرنے میں اسے کوئی عار نہیں تھا، مگر صرف کام کرنے کی مشین بن جانے پر وہ تلملا اٹھی تھی۔اس گھر کے لئے یا اس گھر میں ہونے والے کسی بھی فیصلے سے اسے لاعلم رکھا جاتا تھا۔اسے صرف اتنی ہی بات بتائی جاتی جتنی ضرورت ہوتی۔یہ فلٹر اس کی ساس نے لگایا تھا یا شوہر نے، مگر اس تک فیصلے

اور باتیں ایسی ہی پہنچتیں جیسے کوئی خبر سنا دی گئی ہو۔ جیسے اس گھر سے اس کا تعلق فقط کام کرنے کی حد تک ہو۔ جب یہ احساس اس کے اندر جاگا تو اس نے شروع شروع میں کام کاج سے ہاتھ روک کے احتجاج کرنا شروع کیا مگر کسی پر کوئی اثر نہ ہوا، پھر اس کی ہنسی دکھ میں بدلنے لگی مگر کسی نے ذرا برابر بھی پروا نہیں کی۔ وہ بغیر کہے سب کے دکھ پڑھ لیتی تھی، اب اس کے دل میں ایک شکایت گھر کرنے لگ گئی تو یوں لگا جیسے دیواروں اور دروازوں نے بھی کان اور آنکھیں لپیٹ لی ہیں اور پھر کبھی کبھی وہ ثاقب سے کہہ ہی دیتی:

" کچھ کرنے سے پہلے کبھی مجھ سے بھی کچھ پوچھ لیا کرو، میں نے بی اے پاس کیا ہے، ابا کہتے تھے خاوند اپنی بیویوں سے مشورے کرتے ہیں اس لئے انہوں نے مجھے پڑھایا کہ میں تمھیں اچھے مشورے دے سکوں۔۔مگر کس کام کی میری پڑھائی؟ تم تو مجھے کسی قابل ہی نہیں سمجھتے۔۔۔۔"

"تمھیں کیا مصیبت ہے، تنخواہ کی، گھر کے خرچے کی فکر کرنے کی، دیکھ!! اپنی مرضی سے کھانا پکاتی ہے نا؟ بچوں کے کپڑے اپنی مرضی سے لیتی ہے نا؟ تجھے ہے نہ پوری خود مختاری؟ تیرے کام میں کوئی بولتا ہے؟۔۔۔۔ وہ ایک دم ہی غصے سے چیخنے لگتا تھا۔ پہلے نہیں چیختا تھا، پہلے اسے بہلانے کی کوشش کرتا تھا یا کمرے سے چپ کر کے نکل جاتا تھا ۔مگر اب بات شروع ہوتے ہی چیخنے لگ جاتا تھا وہ اندر سے سہم سی جاتی تھی مگر اوپر اوپر سے بہادر بن کر کہتی رہتی تھی۔۔۔

"یہ تو کوئی ان پڑھ عورت بھی کر لیتی ہے، پھر ابے نے مجھے بی اے کیوں کروایا۔۔ پھر آپ نے بی اے پاس سے شادی کیوں کی۔؟

"مت ماری گئی تھی میری جو تیرے سے شادی کی اور مت ماری گئی تھی تیرے ابے کی جس نے تجھے بی اے کروایا، بی اے کروایا تھا تو کہیں منشی لگوا دیتا، میرے متھے تو نہ مارتا

۔ ہزار دفعہ بتایا ہے، پتہ نہیں تجھے کیا وہم ہو گیا ہے کہ تجھ سے باتیں چھپائی جاتی ہیں، مشورے نہیں لئے جاتے۔۔ کم عقلے! تجھ سے متعلقہ باتیں تجھے بتا دی جاتی ہیں، چھپایا کچھ نہیں جاتا بس جو تیرے مطلب کی باتیں نہیں، انہیں تجھے بتانے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔۔ کھوپڑی کھول اپنی، بی اے کی سند نے دل کے ساتھ ساتھ دماغ بھی چھوٹا کر دیا ہے۔۔"

اب وہ بولنے پر آتا تو چپ ہی نہیں کرتا تھا، چھوٹے دل کے طعنے پر وہ اتنی افسردہ ہو جاتی کہ بولنے کی بھی ہمت نہ باقی بچتی۔۔

پھر اسے لگتا سارا قصور اس کے ابے کا ہی ہے جس نے اسے فضول اتنا پڑھایا۔ یا اس کا اپنا ہے کیوں پڑھنے میں وقت اور ذہن خراب کیا۔۔ نہ پڑھتی نہ ایسے عجیب عجیب خیال ذہن میں آتے اور آرام سے جیسے ثاقب کہتا ہے "اور کیا چاہیئے"۔۔ میں خوش رہ لیتی۔۔"

مگر اب تو بی اے کی ڈگری نے اس کا خانہ خراب کیا ہوا تھا، کیسے اپنے آپ کو "چیز" سمجھ کر کونے میں دھرا رہنے دیتی، "فرد" ہونے کا احساس مارے دے رہا تھا۔۔ کم اہمیتی اور کم ہمتی نے اس کے اندر کمزور سی بغاوت کو جنم دے دیا تھا اور بستر میں اور کچن میں جہاں اس کی خود مختاری کا اعلان ہو چکا تھا، وہاں وہ اپنے فرائض سے سستی برتنے لگ گئی تھی۔۔ جیسے جنگ کے سب سے کمزور پیادے نے حکمت عملی سوچ لی ہو۔۔

"متعلقہ باتیں۔۔ کیا ہیں مجھ سے متعلقہ باتیں؟ بستر میں ہونے والی باتیں یا کچن کی؟ ہُم۔۔ ان سب کے لئے ابا نے پڑھایا تھا۔۔ یہ تو کام والی چھیمو مجھ سے بہتر جانتی ہو گی۔۔۔" جب کوئی نہ سنتا تو خود سے ہی بات کر لیتی۔

جنگی حکمت عملی کے تحت جب اس نے متعلقہ باتوں" سے بھی لاپرواہی اور سستی

برتنی شروع کر دی تو اب چیخنے کی باری ثاقب اور اس کی ماں کی تھی۔ جب وہ کام کی نہیں رہی تھی تو شکایت کا حق کھو بیٹھی تھی، اور اب انتقام لینے لگی تو گالی گلوچ کی مستحق قرار پائی۔

راحت اپنے ابا کی باتیں اور ارادے بھی بھولتی جا رہی تھی مگر پھر بھی اس کی آنکھوں کے آگے کبھی کبھی وہ منظر آ بستا جب ابا اماں کو باتوں باتوں میں اپنے کاروبار میں دلچسپی لینے پر مجبور کرتا رہتا تھا، "ادھر آ کر بیٹھ اللہ لوک دیکھ، سمجھ میں کیا کام کرتا ہوں۔ نفع کیسے ہوتا ہے اور نقصان کیسے ہوتا ہے۔ ادھر آ ذرا، بتا تو سہی اگر دکان میں چینی کی بوریوں کی جگہ آٹے کے تھیلے زیادہ ڈلوانے شروع کر دوں؟ کیا کہتی ہے؟" اور اتنی سی بات پوچھنے پر اماں کے گال خوشی سے لال ہو جاتے تھے۔ جیسے کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔

وہ اماں کو ایسا خوش ہوتا دیکھ کے حیرانگی سے پوچھتی تھی "اماں، ابا ایسے خشک حساب تجھے بتاتا ہے تو اتنی خوش کیوں ہوتی ہے"۔

"دیکھ راحتے! شادی کے شروع شروع کے دنوں میں جب تیرا ابا مجھے روز رات کو پھولوں کے گجرے پہناتا تھا تو مجھے لگتا تھا بس یہی دنیا ہے،، جب ہم اکٹھے ایک تھالی میں کھانا کھاتے تھے تو لگتا تھا میاں بیوی میں اس سے زیادہ کیا پیار ہو سکتا ہے۔ مگر جب آہستہ آہستہ تیرے ابے نے مجھے اپنی ہر چھوٹی بڑی بات کا راز دان بنا لیا اور ہر بات میں مجھ سے مشورہ کرنے لگ گیا تو مجھے احساس ہوا کہ اصلی ساتھ یہ نہیں کہ روز اس کے لائے ہوئے گجرے پہنوں یا اس کے ساتھ ایک تھالی میں کھانا کھاؤں، اصل ساتھ تو یہ ہے۔۔ بیوی ہونا کوئی بڑی بات نہیں، ساتھی ہونا ہی ساری بات۔۔ اور تیرے ابے نے مجھے بیوی نہیں ساتھی بنایا ہوا ہے اور اس" ساتھ "میں ہم دونوں جی خوش رہتے ہیں ساتھ کا یہ احساس، کبھی نہ ختم ہونے والی خوشی ہے "

تب اسے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا، وہ جمائیاں لیتی، اور یہ سوچتی رہی کہ، "توبہ ابے نے

دو جماعتیں پڑھی اماں کو بھی میری استانی جتنی باتیں سکھا دی ہیں"

تھوڑی بڑی ہوئی تو پتہ چلا ابے نے اماں کو باتیں ہی نہیں، اعتماد دے کر سلیقہ شعاری بھی سکھا دی تھی۔۔ اماں نے کئی رنگوں کے جوتوں کے ڈبے اکٹھے کر رکھے تھے، راحت سے ہر ڈبے پر علیحدہ علیحدہ نام لکھوا کے رکھے ہوئے تھے ۔۔ یہ سکول فیس کا ڈبہ، یہ گھر کے بلوں کا ڈبہ، یہ بشیر کے جوتوں کے لئے جوڑے ہوئے پیسوں کا ڈبہ۔۔ ایک دن اس نے اپنی کالج لیکچرر کو اماں کے اس طریقے کے بارے میں بتایا تھا تو وہ حیرت اور خوشی سے بولی "اللہ تمھاری اماں ہمارے ملک کی وزیرِ خزانہ بن جائیں تو ملک کو مہینوں میں منافع میں لے آئیں گی"۔

سب اسے استانی کا مذاق سمجھ کر ہنس پڑی تھیں۔۔۔

مہینے کے آخر میں ابا جب فخر سے سب بچوں کو بتاتے "دیکھو تمھاری ماں نے کیسی بچت کی ہے" تو اماں کے چہرے پر ایسے اعتماد کے رنگ بکھرتے جو شائد کسی ملک کے وزیرِ خزانہ کے چہرے پر اس وقت بھی نہ بکھرتے ہونگے جب وہ سالانہ ملکی بجٹ کو خسارے سے بچاتا ہوگا۔۔

"ثاقب، حسن کا داخلہ کروانے سے پہلے مجھ سے پوچھ تو لیتے کہ کس سکول میں کروانا ہے؟" بچوں کے معاملے میں بھی راحت نے جب خود کو بے اختیار پایا تو وہ رو ہی اٹھی۔

"یہ تمھیں کیا شوق ہے مفت کی مصیبتیں پالنے کا، میرے دوست نے بتایا تھا علاقے کا سب سے اچھا سکول ہے، فیس بھی ہمارے مطابق ہے، فیس کا حساب تو میں نے ہی دیکھنا ہے نا، تو تیرا کیا کام سر کھپانے کا؟ دوست کے بچے بھی وہیں پڑھتے ہیں اور اس کی بیوی وہاں کے معیار سے مطمئن ہے تو بس کروا دیا"۔۔۔ شوہر نے جیسے یہ لاپرواہی اپنے

بدن پر مستقل اوڑھ لی تھی۔۔

"اس کی بیوی مطمئن ہے، میں تو نہیں نا؟۔۔ مجھے تو پتہ چلے۔۔" اس نے آنکھوں میں آئے آنسو پی لئے، یہ سوچ کر کے کوئی دیکھ نہ لے۔ کیونکہ اب کوئی دیکھ بھی لیتا تھا تو کسی پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اپنی بے حرمتی تو برداشت کر لیتی تھی، آنسوؤں کی نہیں برداشت ہوتی تھی۔۔۔

اس نے اس دن سے کسی کے بھی سامنے رونا چھوڑ دیا تھا، جب اس کی ساس نے اسے روتے دیکھ کر کہا تھا "ایسی ناشکری عورت میں نے زندگی بھر نہیں دیکھی، کھلا کھانے کو ہے، کوئی پوچھنے والا نہیں، کوئی روک ٹوک نہیں، مرضی سے سوتی اٹھتی، پھر بھی جب دیکھو رونا دھونا مچایا ہوتا۔۔ بی بی اس گھر میں نحوست نہ پھیلاؤ"۔۔۔ تب سے اس نے آنسوؤں کے سر عام بہنے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔۔

"ارے اماں تم ہی کھانا بھجوا دو، یہ تو کان ہی کھائے گی بس۔۔ لیکن ٹھہرو میں خود ہی باہر آ جاتا ہوں"۔۔۔ ثاقب کمرے سے نکل گیا کیونکہ جانتا تھا اب راحت کا منہ پھولا رہے گا۔۔" کون اسے منانے میں وقت برباد کرے اور منانے کے بعد بھی بے سوادی سی، چوبیس گھنٹے کی بک بک، عورت ذات ہے ہی ناشکری"۔۔

ثاقب اور اس کی ماں ٹھیک ہی کہتے تھے، "نا کوئی دکھ، نہ غم۔۔ بڑی ناشکری ہوں میں۔۔"

باہر بلو رانی شور مچا رہی تھی۔ لگتا پھر کسی نے اسے مارا ہے چیاؤں چیاؤں کی آواز سے وہ خیالوں سے چونکی۔۔۔

اس نے دروازے سے باہر نکل کر محلے کے ایک بچے کو آواز دی، کیا ہوا بلو رانی کو کیوں رو رہی ہے۔۔۔

"رو رہی ہے؟ بچے نے حیرت سے اسے دیکھا۔۔

آپا، وہ بھونک رہی ہے۔ اب تو ہر وقت بھونکتی ہی رہتی ہے۔ ابا کہہ رہا تھا کسی کام کاج کی نہیں رہی۔۔" بچے نے اپنے ابے کی آواز کی ہو بہو نقل کی۔۔

"دیکھ مٹھو کوئی ایسے ہی نہیں بھونکتا اور بلو رانی کیوں ایسے بھونکے گی کچھ تو ہوا ہوگا۔۔"راحت کو جیسے بلو رانی کے دل کی بات پتہ تھی.

"جا اسے پکڑ کے لا، میں اسے کچھ کھلا دوں۔۔" راحت نے بچے کو پیار سے پچکارتے ہوئے کہا۔۔

"نہ آپا نہ۔۔ اسے اب کوئی نہیں ہاتھ لگاتا، بھونکتی ہے یا کاٹنے کو پڑتی ہے، پہلے نکمی ہوئی تھی اور اب پاگل بھی ہو گئی ہے۔۔"

"کیا نکمی ہو گئی ہے مٹھو ایسے نہیں کہتے۔۔۔" راحت نہ جانے کیوں بلو رانی کا کیس ایک چھوٹے سے بچے کے سامنے لڑ رہی تھی۔

"آپا کل شیخ صاحب کے گھر چوری ہو گئی ہے اور یہ بلو رانی، مہارانی بنی گھومتی رہی، ابا کہہ رہا تھا اب یہ چوروں کے لئے نہیں محلے والوں کے لئے خطرہ بن گئی ہے. پتہ ہے آپا، سب ادھر ہی آپ کے گھر کے سامنے والے خالی میدان میں اکٹھے ہو رہے ہیں، پنچائیت لگنے لگی ہے، وہاں فیصلہ ہونا ہے کہ اس کا کیا کیا جائے، خود زہر دے دیں اس سے پہلے کہ کسی کو کاٹ کھائے یا میونسپلٹی والوں کو بلا کر اسے بھی اس کے بچوں کی طرح اٹھوا دیا جائے۔۔ ابا کہہ رہا تھا ہو سکتا ہے اس طرح اپنے بچوں کے پاس ہی پہنچ جائے۔۔" بچے نے بڑے رازدارانہ انداز سے پنچائیت میں ہونے والی ممکنہ باتوں اور فیصلوں سے اسے آگاہ کیا۔

"زہر کیوں؟ وہ کانپ کے رہ گئی۔

"ارے آپ کو نہیں پتہ پرسوں مسجد میں گھس گئی تھی اور اسکی وجہ سے ساری نماز